مارچ ۹۳

الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

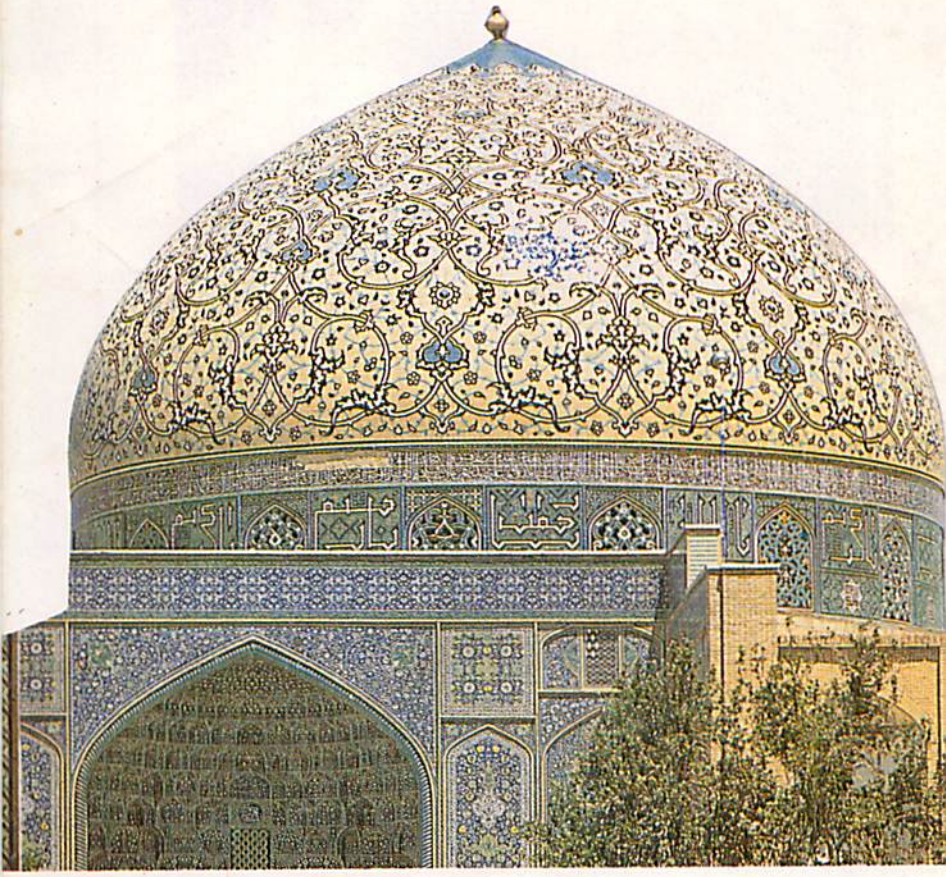

لوگ صرف اپنے ساتھ انصاف کرنا جانتے ہیں
دوسرے کے معاملہ میں انصاف کرنا کسی نے نہیں سیکھا

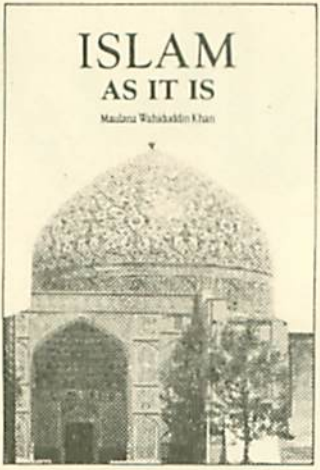

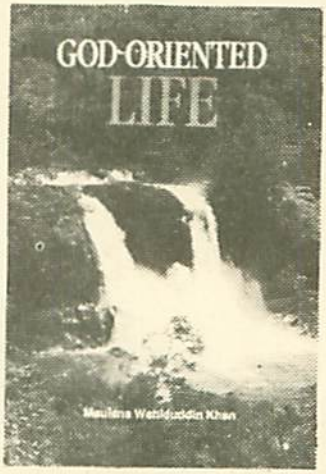

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مارچ ۱۹۹۳ ، شمارہ ۱۹۶

ایک نشانی	۴	تین قسم	۱۶
فرضی وہم	۵	ذہنی تربیت	۱۷
روزہ کیا ہے	۶	بامقصد تخلیق	۱۸
سفر حیات	۸	زلزلہ کی خبر	۱۹
قدرت کی تعلیم	۹	دوسرا لفظ	۲۰
ایک رپورٹ	۱۰	لفظ کا فرق	۲۲
ذکر و فکر	۱۱	ناقص، جامع	۲۴
ناگزیر مسئلہ	۱۲	نیا انقلاب	۲۶
ذہن کی تعمیر	۱۳	فرد اور سماج	۲۸
خواب منتشر ہو گیا	۱۴	سفرنامہ — ۲	۳۱
تعلیم و تربیت	۱۵	سفرنامہ افریقہ — ۳	۳۹

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel 697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn: Al-Risala)
Single Copy Rs 6; Annual Subscription Rs 72/ $25 (Air-mail)

ایک نشانی

پچھلے روز ایک لیڈر کا انتقال ہو گیا۔ آج ٹی وی پر اس کے حالات دکھائے گئے۔ اتفا
سے مجھے اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کل کے اخبار میں میں نے اس کے انتقال کی خبر پڑھی تھ
آج میں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا کہ وہ چل رہا ہے۔ وہ تقریر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں سے ملاقا
اور بات چیت کر رہا ہے۔ اس طرح دیر تک ٹی وی پر اس کی زندگی دکھائی دیتی رہی۔

اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ٹی وی مجھ سے یہ کہہ رہا ہو کہ جس آدمی کو تم نے سم
تھا کہ وہ مر گیا، وہ مرا نہیں۔ وہ اب بھی زندہ حالت میں موجود ہے۔ وہ اب بھی ٹھیک اسی طر
زندہ ہے جیسا کہ وہ موت کا واقعہ پیش آنے سے پہلے زندہ تھا۔ اگر تم کو "ٹی وی" کی نگاہ حاص
ہو جائے تو آج بھی تم اس کو پہلے کی طرح چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہو۔

ٹی وی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں کو دکھ
ہے۔ وہ آج محدود طور پر ان چیزوں کو ظاہر کر رہا ہے جو آئندہ مکمل طور پر تمام لوگوں کے سا
ظاہر ہو جائیں گی۔ وہ گویا کل مشاہدہ سے پہلے حقائق کا جزئی مشاہدہ ہے۔

آدمی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ بچے سے بڑا ہوتا ہے۔ صبح و شام کی صورت میں اس کے
دن گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا آخر وقت آجاتا ہے۔ وہ دنیا کے ماحول سے نکال
لیا جاتا ہے تاکہ اس کو آخرت کے ماحول میں بسایا جائے اور اس کے اعمال کے مطابق اس
کی ابدی زندگی کا فیصلہ کیا جائے۔

ہر وہ شخص جو پیدا ہوا ہے، وہ ضرور ایک دن موت سے دوچار ہوگا۔ اور موت کے
بعد ضرور وہ آخرت کی دنیا میں داخل کیا جائے گا جہاں اس کو خدا کی عدالت میں اپنا مکمل
حساب دینا پڑے۔ جس طرح زندگی یقینی ہے، اسی طرح موت یقینی ہے۔ اور جس طرح موت
یقینی ہے، اسی طرح قیامت اور آخرت کا معاملہ بھی یقینی ہے۔ آدمی اس سے بھاگ نہیں سکتا
البتہ وہ تیاری کر کے اس کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ دانش مند وہ ہے جو آج کے
اندر کل کو دیکھ لے۔ جو آج کے واقعہ میں اپنے کل کے لیے نصیحت حاصل کر لے۔

فرضی وہم

ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کو ہائپوکونڈریا (hypochondriasis). کہا جاتا ہے۔ جو شخص
ں بیماری میں مبتلا ہو وہ خیالی طور پر اپنے کو بیمار سمجھنے لگتا ہے حالانکہ فی الواقع وہ بیمار نہیں
وتا۔ اس مرض میں مبتلا ہونے والے لوگ یہ یقین کر سکتے ہیں کہ بیماریاں موجود ہیں، اگرچہ فی الواقع
یسا نہ ہو :

The hypochondriac may become convinced that diseases exist even though they are absent. (V/257)

۲۸ جولائی ۱۹۹۲ کی ملاقات میں پونہ کے جناب فرحات ہارون خاں صاحب نے
نایا کہ ۱۹۷۱ میں ان کی ملاقات ایک ۲۰ سالہ عرب طالب علم محمد عبد الغفار سے ہوئی۔ وہ بحرین
ا رہنے والا تھا اور پونہ میں تعلیم کے لیے آیا تھا۔ اس کو اپنے بارہ میں یہ خیال ہو گیا کہ
ندستانی غذائیں کھاتے کھاتے اس کی صحت تباہ ہو گئی ہے۔ وہ کسی مہلک مرض میں مبتلا ہے۔
اس نے فرحات ہارون صاحب سے کہا کہ مجھے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے چلئے۔
رحات صاحب اس کو پونہ کے ڈاکٹر ایس ایم ایچ مودی کے یہاں لے گئے۔ ڈاکٹر مودی
نے نوجوان کا معائنہ کیا۔ مختلف قسم کے ٹیسٹ لیے۔ چند دن کے بعد اس نے فرحات
ا صاحب سے کہا کہ ان کو بتا دیجئے کہ ان کو کوئی بیماری نہیں، وہ گھوڑے کی طرح ٹھیک ہیں :

He is as fit as a horse.

اکٹر مودی کا فیصلہ معلوم ہونے کے بعد اچانک عرب نوجوان کی ساری پریشانی ختم ہو گئی۔ وہ معتدل
دمی کی طرح رہنے لگا۔ اب وہ ایسا ہو گیا جیسے کہ وہ کبھی بیمار ہی نہ تھا۔
بیماری کی یہ قسم صرف افراد تک منحصر نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کو بھی یہی نفسیاتی
اری لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کے رہنماؤں کی غلط رہنمائی اس کو اس بے بنیاد اندیشہ میں مبتلا
دیتی ہے کہ ہر طرف سے اس کو خطرات نے گھیر رکھا ہے۔ ایسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کو
ں فرضی وہم سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد وہ آپ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے گی۔

روزہ کیا ہے

روزہ کیا ہے۔ روزہ اپنے آپ پر قابو پانے کی تربیت ہے۔ وہ سلف کنٹرول کی مشق ہے۔ سلف کنٹرول کی اس مشق کے لیے ایک ایسی چیز کو چنا گیا ہے جو انسان کی تمام ضرورتوں میں سب سے زیادہ اہم ضرورت ہے۔ یعنی کھانا اور پانی۔ رمضان کے مہینہ میں ۳۰ دن تک صبح سے شام تک کا کھانا اور پانی چھڑایا جاتا ہے تاکہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو کہ وہ چاہنے کے باوجود کسی چیز کو چھوڑ سکے۔ تاکہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ جب وہ یہاں کسی چیز کو لے تو اصول کی بنیاد پر لے، اور جب کسی چیز کو چھوڑے تو اس کو بھی اصول کی بنیاد پر چھوڑے۔ اس کی چاہت اس کے شعوری فیصلہ کے تحت ہو نہ کہ شعوری فیصلہ سے آزاد۔

روزہ کے مہینہ میں کھانا اور پانی کا ترک حقیقۃً ایک علامتی ترک ہے۔ اس کا مطلب نہیں ہے کہ خاص اوقات میں ایک خاص مدت تک بس کھانا اور پینا چھوڑ دینے سے روزہ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد آدمی آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ نہیں۔ بلکہ روزہ میں کھانے اور پینے کا علامتی ترک زیادہ وسیع ترک کا آغاز ہے۔ روزہ کے مہینہ میں ایک چیز کو چھوڑنے کی تربیت دے کر آدمی کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ بقیہ مہینوں میں وہ زیادہ وسیع پیمانہ پر تمام غیر مطلوب چیزوں کو چھوڑ دے۔

آدمی ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ اس دنیا میں مختلف قسم کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ ان سماجی تعلقات کے دوران طرح طرح کے ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ یہ حالات آدمی کے اندر اشتعال اور ردعمل کی نفسیات ابھارتے ہیں۔

ایسے اوقات میں آدمی کیا کرے اور کیا نہ کرے، اسی کو بتانے کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے۔ روزہ کا سبق یہ ہے کہ آدمی ایسے مواقع پر سلف کنٹرول کا طریقہ اختیار کرے۔ جب کبھی اس کے دل میں دوسروں کے خلاف غصہ آئے یا دوسروں کے خلاف اشتعال پیدا ہو تو وہ ایسے جذبات کو روکے، وہ ایسے جذبات کو اپنے اندر ہی اندر دبا لے۔ ایسے مواقع پر وہ اپنے مشتعل جذبات کو روکنے والا بنے نہ کہ ان کو ظاہر کر دینے والا۔

اسی طرح آدمی کے اندر طرح طرح کے جذبات ہیں۔ مثلاً حرص، طمع، حسد، گھمنڈ، فخر، خودغرضی
برہ۔ یہ جذبات بجائے خود برے نہیں ہیں۔ کیوں کہ یہی جذبات ہیں جو آدمی کے اندر حرکت
رعمل پیدا کرتے ہیں۔ ان جذبات کو اگر جائز حدود کے اندر استعمال کیا جائے تو وہ مفید ہیں۔ اور
جائز حدود کی پروا کیے بغیر ان جذبات کو بے قید طور پر استعمال کیا جانے لگے تو وہ سماج کے
یلے مصیبت بن جاتے ہیں۔

روزہ اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی ان جذبات کو ان کی حد کے اندر رکھے۔ وہ اپنے
جذبات کو ان کی واقعی حد کے اندر استعمال کرے۔ وہ اپنے ان جذبات کے استعمال کی ایک
مقرر کرے۔ وہ حد یہ ہے کہ یہ جذبات جب تک اپنے جائز مفاد کے لیے استعمال ہوں تو ان کا
ستعمال ٹھیک ہے۔ اور جب وہ اپنے جائز مفاد سے گزر کر دوسروں کو نقصان پہنچانے والے بن
ئیں تو وہاں آدمی اپنے ان جذبات کو روک لے۔

روزہ کو حدیث میں صبر کا مہینہ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ پابند زندگی
ارنے کی مشق ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس دنیا میں با اصول زندگی گزارے۔
بے قید اور بے اصول زندگی گزارنے سے پرہیز کرے۔ رمضان کے مہینہ میں تربیتی روزہ
تا ہے اور بقیہ مہینوں میں اسی تربیت کے مطابق زندگی گزارنا۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر کھانا اور پینا چھوڑے مگر وہ جھوٹ بولنا اور جھوٹ
ل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا ظاہر تو کھانا اور پینا چھوڑنا ہے۔ مگر روزہ کی اصل
پرٹ یہ ہے کہ آدمی جھوٹی باتوں کو اور دوسرے برے اعمال کو چھوڑ دے۔ روزہ دراصل
ئیوں کو چھوڑنے کی تربیت ہے۔ کسی روزہ دار میں اگر روزہ کا ظاہری پہلو ہو مگر اس میں
زہ کا اندرونی اور اخلاقی پہلو نہ پایا جائے تو ایسے آدمی کا روزہ اسلام میں معتبر نہیں۔

ٹ : آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۱ فروری ۱۹۹۲ کو نشر کیا گیا۔

سفرِ حیات

جیومٹری کے اصولوں میں سے ایک مشہور اصول یہ ہے کہ ——— دو نقطوں کے درمیان قریب ترین فاصلہ سیدھی لکیر کا ہوتا ہے :

A straight line is the shortest distance between two points.

یہ بات روشنی کے سفر کے لیے نہایت درست ہے۔ کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ روشنی ہمیشہ خطِ مستقیم (سیدھی لکیر) کے اصول پر سفر کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس اصول کو انسانی زندگی کے سفر کے لیے استعمال کرنے لگے تو اس کا سفر صرف بھٹکاؤ کے ہم معنی بن کر رہ جائے گا۔

اگر آپ اپنے گھر سے نکلیں اور یہ چاہیں کہ آخری منزل تک بالکل خطِ مستقیم پر سفر کریں تو ایسا کرنے کی صورت میں کہیں آپ کسی کھڈ میں جا گریں گے۔ کہیں کسی پہاڑ سے ٹکرا جائیں گے۔ کہیں دریا کی موجیں آپ کے سفر کو موت کا سفر بنا دیں گی۔ اس لیے کوئی بھی آنکھ والا آدمی ایسا نہیں کرتا کہ وہ خطِ مستقیم کے اصول پر اپنا سفر جاری کر دے۔ ہر آنکھ والا آدمی مقاماتِ سفر کی رعایت سے اپنے سفر کا رخ متعین کرتا ہے۔ وہ جیومٹری کے اصول کے تحت کبھی اپنے سفر کا راستہ نہیں بناتا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ساری دنیا میں مفروضہ اعداءِ اسلام کے خلاف جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے سفرِ حیات کے لیے اٹھتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے راستے میں دریا اور پہاڑ کی مانند کچھ قومیں حائل ہیں۔ وہ فوراً ان قوموں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیتے ہیں یہ طریقہ جو موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ گویا خطِ مستقیم میں سفر کرنے کی کوشش ہے۔ مگر ایسی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی سرگرمیاں صرف موت کی سرگرمیاں ہیں۔ وہ ہرگز زندگی کی سرگرمیاں نہیں۔

زندگی کا سفر جیومٹری کے اصول پر طے نہیں ہوتا۔ وہ حالات کی موافقت اور ناموافقت کو دیکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ سفرِ حیات کا حقیقت پسندانہ منصوبہ وہی ہے اور وہی منصوبہ اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے جس میں خارجی حالات کی پوری رعایت شامل ہو۔

قدرت کی تعلیم

ٹیک (teak) ایک عمارتی لکڑی ہے۔ ٹیک کا سب سے بڑا پیداواری ملک برما ہے۔ اس کے بعد ہندستان، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور سری لنکا میں ٹیک کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہندستان میں تقریباً دو ہزار سال سے اس کا استعمال کیا جارہا ہے۔

ٹیک کی سب سے اہم صفت، ایک ماہر کے الفاظ میں، اس کی غیر معمولی طویل مر (extraordinary durability) ہے۔ ہزار سال پرانی عمارتوں میں بھی ٹیک کی لکڑی کے بیم اچھی حالت میں پائے گئے ہیں۔ قدیم زمانہ میں کشتی اور پل وغیرہ اکثر اسی لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔

ٹیک کی لکڑی کے دیرپا ہونے کا خاص سبب یہ ہے کہ، عام لکڑیوں کی طرح، اس میں دیمک نہیں لگتا۔ دیمک لکڑی کا دشمن ہے، دیمک لگنے کے بعد کوئی لکڑی دیر تک صحیح حالت میں باقی نہیں رہتی۔ مگر ٹیک کے لیے دیمک کا خطرہ نہیں، اس لیے اس کی دیرپائی کو کوئی چیلنج کرنے والا بھی نہیں۔

ٹیک کی وہ کون سی صفت ہے جس کی بنا پر وہ دیمک کے خطرہ سے محفوظ رہتی ہے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ ٹیک کی لکڑی میں ایک قسم کا کڑوا ذائقہ ہوتا ہے۔ یہ ذائقہ دیمک کو پسند نہیں۔ لکڑی ہی دیمک کی خوراک ہے۔ مگر ٹیک کی لکڑی استثنائی طور پر دیمک کے ذائقہ کے مطابق نہیں، اس لیے دیمک اس کو اپنی خوراک بھی نہیں بناتا۔

اس مثال سے قدرت کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ قدرت نے یہ چاہا کہ وہ ٹیک کو دیمک سے بچائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ٹیک کو شور و غل اور احتجاج کا طریقہ نہیں سکھایا۔ قدرت نے سادہ طور پر یہ کیا کہ خود ٹیک کے اندر ایک ایسی صفت پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں دیمک اپنے آپ اس سے دور ہو جائے۔

اس دنیا میں جس طرح لکڑی کا دشمن دیمک ہے۔ اسی طرح یہاں انسانوں میں بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اب انسان ان سے بچنے کے لیے کیا کرے۔ اس کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے اندر ایسی صفت پیدا کر لے جس کا دشمن اپنے آپ ہی اس سے دور رہے۔ وہ اس کے خلاف کارروائی کرنے سے خود بخود رک جائے۔

ایک رپورٹ

مسیحی چرچ نے عالمی سطح پر ایک مذہبی جائزہ لیا ہے۔ اس کا خلاصہ انگریزی میگزین کرسچینٹی ٹوڈے نے شائع کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ۱۹۳۴ سے اب تک اسلام میں ۵۰۰ فی صد کی رفتار سے اضافہ ہوا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں مسیحیت میں صرف ۴۷ فی صد کا اضافہ ہوا ہے دونوں میں سے ہر ایک مذہب کے ماننے والوں کی تعداد اس وقت ساری دنیا میں ایک بلین ہے۔ ہندوازم کو ماننے والوں کی تعداد ۵۰۰ ملین ہے۔ بدھزم کو ماننے والوں کی تعداد ۲۴۵ ملین ہے اور یہودیت کو ماننے والوں کی تعداد ۱۵ ملین :

Christianity Today magazine (March 1992) reported that since 1934, Islam has grown by 500 per cent and Christianity by 47 per cent. Both religions have about a billion followers, followed by Hinduism with 500 million followers, Buddhism with 245 million followers and Judaism with about 15 million followers.

اس جائزہ کے مطابق، ۶۰ سال پہلے، اسلام کے ماننے والوں کے مقابلہ میں مسیحیت کو ماننے والوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ مگر آج دونوں مذہب کو ماننے والوں کی تعداد تقریباً یکساں ہو چکی ہے۔ یہ رفتار اگر اسی طرح جاری رہتی ہے تو اکیسویں صدی کی آمد تک اہل اسلا کی تعداد یقینی طور پر تمام مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد سے زیادہ ہو جائے گی۔

تاہم صرف تعداد کا اضافہ خوش ہونے کے لیے کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضرو ہے کہ اس بڑھتی ہوئی تعداد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ تعلیم میں پیچھے ہیں۔ علی گڑھ (ہندستان) میں مسلم کالج سو برس پہلے قائم ہوا جو بعد کو مسلم یونی ورسٹی بن گیا۔ مسلمان فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسلم یونی ورسٹی صرف ایک ادارہ نہیں، و ایک عظیم تحریک ہے۔ مگر ایک حالیہ جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ علی گڑھ ضلع کے دیہاتوں میں آر بھی صرف دو فی صد مسلمان ایسے ہیں جن کو تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے (اسٹیٹسمین ۱۲ اپریل ۱۹۹۲ کتنا زیادہ کام ہو چکا۔ اس کے باوجود کتنا زیادہ کام کرنا ابھی باقی ہے۔

ذکر و فکر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے (ولذکر اللہ اکبر)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک گھڑی کا سوچنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے
تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ)

ذکر و فکر سے متعلق جو آیتیں اور حدیثیں ہیں، ان کا ایک مطلب خالص روحانی ہے۔ یعنی اللہ کی صفتوں کو یاد کرنا اور ان سے ان جذبات و کیفیات کا دل میں پیدا ہونا جن کو قرآن میں خشوع، تضرع، انابت، اخبات وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کیفیت دین کا اصل مطلوب ہے اور یہی خود عبادت کا بھی خلاصہ ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے ایک اور بہت اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ علم کی فوقیت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی عمل (physical activity) کے مقابلہ میں ذہنی عمل (mental activity) کی اہمیت زیادہ ہے۔ جسم کی حرکت سے آدمی جو کام کرتا ہے، اس سے بہت زیادہ قیمت اس کام کی ہے جو وہ دماغ کی حرکت کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔ ایک گھڑی کا دماغی کام ایک سال کے جسمانی کام کے برابر ہے۔

ایک مزدور بھی محنت کرتا ہے اور ایک انجینیر بھی۔ مگر مزدور کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے، اس سے بہت زیادہ معاوضہ وہ ہے جو انجینیر کو ملتا ہے۔ اسی مثال سے جسم اور ذہن کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

جسمانی محنت اگر ہتھوڑا چلاتی ہے تو دماغی محنت مشین چلاتی ہے۔ جسمانی محنت پاؤں سے سفر کرتی ہے تو دماغی محنت کار اور ہوائی جہاز کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ جسمانی محنت ظاہر کو جانتی ہے تو دماغی محنت حقیقت کا پتہ کر لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر تلوار سے لڑتی ہے تو دماغی محنت لڑائی کیے بغیر جنگ جیت لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر آدمی کو دکھائی دینے والی دنیا تک پہنچاتی ہے تو دماغی محنت کے ذریعہ آدمی غیب تک اور خدا کی چھپی ہوئی دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔

ناگزیر مسئلہ

اینی برانٹ (Anne Bronte) ایک خاتون ادیب ہیں۔ وہ انگلینڈ میں ۱۸۲۰ میں پید ہوئیں اور ۱۸۴۹ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی کا سبق ملتا ہے۔ ان ایک قول یہ ہے کہ اس غیر معیاری دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ہمیشہ ایک مگر موجود رہتا ہے :

There is always a 'but' in this imperfect world.

یہ بلا شبہ ایک حکیمانہ قول ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس لیے یہا معیار کی حالت کو پانا ممکن نہیں۔ یہاں مختلف قسم کی محدودیتیں ہیں۔ یہاں ہر انسان کو قول وفعل آزادی حاصل ہے۔ یہاں بار بار مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہاں کسی کے لیے بھی ہمو زندگی کا حصول ممکن نہیں۔ یہاں آدمی کو ہمیشہ ایک "مگر" سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لیے ضروری کہ آدمی اپنی کارروائیوں میں اس حقیقت کو سامنے رکھے۔ ورنہ وہ آخر کار ناکام ہو کر رہ جائے گا۔

آپ آزاد ہیں کہ اپنی گاڑی سڑک پر پوری تیز رفتاری کے ساتھ دوڑائیں۔ مگر آپ کو ا پر قدرت نہیں کہ دوسری سمت سے آنے والی گاڑیوں کو روک کر سڑک کو صرف اپنے لیے خا کرلیں۔ آپ ایک ناپسندیدہ جلوس کو روکنے کے لیے اس سے الجھاؤ کر سکتے ہیں مگر آپ ک بس میں یہ نہیں کہ اس کے بعد مسلح پولیس کو مداخلت کرنے سے باز رکھیں۔ آپ اپنے ایک قو اشو کے لیے جلسہ جلوس کا ہنگامہ کھڑا کر سکتے ہیں مگر آپ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ آپ فریق ثا کے اندر مخالفانہ ردعمل پیدا ہونے کو روک دیں۔ آپ اپنی حق تلفی کے نام پر احتجاج او مطالبات کا طوفان برپا کر سکتے ہیں مگر آپ دنیا کے اس قانون کو نہیں بدل سکتے کہ آدمی کو اتن ہی ملے جتنی استعداد اس نے اپنے اندر پیدا کی ہو۔

اس دنیا میں ہر طرف ایک "مگر" کی رکاوٹ کھڑی ہوئی ہے۔ اس رکاوٹ کو جانئے اور اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنائیے۔ اگر آپ نے اس کو نظر انداز کر کے اپ عمل شروع کر دیا تو آخر کار تباہی کے سوا کوئی اور چیز آپ کے حصہ میں آنے وا نہیں۔

ذہن کی تعمیر

اقوام متحدہ کے اقتصادی اور ثقافتی ادارہ کے دستور میں جو باتیں درج ہیں، ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے ـــــ جنگوں کی ابتدا چونکہ ذہن سے ہوتی ہیں اس لیے یہ دراصل لوگوں کے ذہن ہیں جہاں قیام امن کا مورچہ بنایا جائے :

Since wars began in the minds of men, it is in the minds of men that the defence of peace must be constructed. (UNESCO constitution)

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ سڑک پر دو آدمیوں کا جھگڑا ہو یا میدانِ جنگ میں دو قوموں کا ٹکراؤ، اس قسم کی تمام چیزیں ہمیشہ ذہن میں شروع ہوتی ہیں۔ کچھ آدمیوں کے ذہن میں غصہ، اشتعال، انتقام اور نفرت کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی خیالات بھڑک کر جب عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو اسی کا نام جھگڑا یا جنگ ہے، اس لیے اگر ذہن کی سطح پر امن قائم کیا جا سکے تو عمل کی سطح پر بھی امن قائم ہو جائے گا۔

آدمی کے ذہن میں منفی خیالات ہمیشہ ردعمل کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ کسی آدمی نے سخت بات کہہ دی تو آپ کو غصہ آگیا۔ کسی سے ناخوش گوار تجربہ ہوا تو آپ مشتعل ہو گئے۔ کسی نے آپ کے وقار کو مجروح کیا تو آپ کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہی سب چیزیں جو ابتداءً ذہن کے اندر پیدا ہوتی ہیں، وہی باہر آکر جنگ اور فساد برپا کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

ایسی حالت میں انفرادی لڑائی اور قومی جنگ دونوں کو روکنے کا واحد موثر طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کی تربیت کی جائے۔ لوگوں کے اندر وہ مزاج بنایا جائے جس کو مذہب میں صبر کہا جاتا ہے۔ یہ مقصد اس طرح حاصل ہوگا جب کہ لوگوں کی منفی سوچ کو ختم کیا جائے اور ان کے اندر مثبت سوچ پیدا کی جائے۔ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ اشتعال کی باتوں پر مشتعل نہ ہوں۔ وہ ناخوش گوار چیزوں میں الجھنے کے بجائے ان سے اعراض کریں۔ وہ نفرت کے جواب میں محبت کرنا سیکھیں۔ وہ ٹھنڈی سوچ کے تحت فیصلہ کریں نہ کہ جذباتی ابال کے تحت۔

ذہن کی اصلاح عمل کی اصلاح ہے اور ذہن کی تعمیر زندگی کی تعمیر۔

خواب منتشر ہوگیا

سرسید نے ۳ فروری ۱۸۸۴ کو لاہور میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہم نے علی گڑھ میں جو تعلیمی ادارہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ مسلم یونی ورسٹی) قائم کیا ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز قائم کیا جائے۔ میں ہندو اور مسلمان دونوں کو برابر کا درجہ دیتا ہوں۔ میں ہندوؤں کو اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھ کے سمجھتا ہوں (لیکچروں کا مجموعہ، صفحہ ۱۹۸)

سوامی ویویکانند نے ۱۰ جون ۱۸۹۸ کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ ہندو ازم کا خلاصہ وحدت (oneness) ہے، اور اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انسانی اخوت اور انسانی برابری کا ایسا پریکٹیکل نمونہ قائم کیا جیسا نمونہ انسانی تاریخ میں دوسرا کوئی موجود نہیں۔ دونوں کو انڈیا کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ انڈیا میں ایک اچھے مستقبل کی تعمیر ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے ہوگی (لیٹرس آف سوامی وویکانند، صفحہ ۸۰ - ۳۷۹)

۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا۔ اب موقع تھا کہ دونوں گروہ مل کر نئے ہندستان کی تعمیر کریں۔ دونوں فرقوں کے دو اعلیٰ رہنماؤں (اور اسی طرح دوسرے لیڈروں) نے بھرپور طور پر لوگوں کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے باوجود یہ مشورہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تجویز کی ایک قیمت ہے۔ اگر آپ یہ مطلوبہ قیمت ادا کریں تو تجویز واقعہ بنے گی۔ اور اگر قیمت ادا نہ کی جائے تو تجویز صرف الفاظ کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گی، وہ عملی واقعہ کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔

یہ قیمت، ایک لفظ میں، صبر ہے۔ مختلف انسان جب باہم مل کر رہیں تو لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے ناخوش گواری کا تجربہ ہوتا ہے۔ اب قیمت یہ ہے کہ اس شکایت یا اس ناگواری کو برداشت کر لیا جائے۔ بدقسمتی سے دونوں فرقوں میں سے کسی نے بھی یہ قیمت ادا نہ کی۔ اس لیے سرسید اور ویویکانند جیسے لوگوں کے الفاظ ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ وہ ملک کی سماجی زندگی کی تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے۔

تعلیم و تربیت

اگست ۱۹۴۵ میں جاپان مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ اس نے سیاسی آزادی بھی کھو دی اور معاشی استقلال بھی۔ اس کے بعد جاپان نے یہ کیا کہ سیاسی آزادی کے مسئلہ کو چھیڑے بغیر معاشی استقلال کے لیے جدوجہد شروع کر دی، اس طریق کار کے ذریعہ جاپان نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ آج وہ سپر اقتصادی طاقت شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۰ تک جاپان دنیا کو ۵ کھرب ڈالر قرض کے طور پر دے چکا تھا۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۹۵ تک جاپان کے عالمی قرضہ کی مقدار ۱۰ کھرب ڈالر ہو چکی ہوگی۔ جاپان ۱۹۴۵ میں امریکہ کا سیاسی محکوم تھا، آج جاپان نے خود امریکہ کو اپنا اقتصادی مقروض بنا لیا ہے۔

پاکستان کے ایک کالم نویس مسٹر ابوذر غفاری مئی ۱۹۹۲ میں کابل گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک جاپانی صحافی سے ہوئی، انھوں نے جاپانی صحافی سے پوچھا کہ جاپان کی اس حیران کن ترقی کا راز کیا ہے۔ کس طرح ایسا ہوا کہ جاپان نے ایک ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

جاپانی صحافی نے جواب دیا کہ جاپان کی اعلیٰ ترقی کا راز جاپانی قوم کے اعلیٰ کردار میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس قدرتی وسائل نہیں۔ اس لیے ہم اپنے بچوں ہی کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ جاپان کا ایک ایک گھر گویا جاپانی بچہ کی تربیت گاہ ہے۔ جاپان کے لوگ اپنے بہترین وسائل اپنے بچہ کی تعلیم پر صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ جاپانی قوم اس وقت مکمل طور پر ایک تعلیم یافتہ قوم ہے۔ ہمارے یہاں جہالت کا کوئی وجود نہیں۔ جاپان میں اتنے زیادہ سائنسی تعلیم یافتہ لوگ ہیں کہ آپ جاپان کو ایک سائنسی قوم کہہ سکتے ہیں۔

اس تعلیم و تربیت نے جاپان کے لوگوں میں اعلیٰ ترین قومی کیرکٹر پیدا کر دیا ہے، مثلاً جاپانی قوم انتہائی محب وطن قوم ہے۔ اگر قوم کا ایک روپیہ کا نقصان ہو رہا ہو تو ایک جاپانی اپنی قوم کو ایک روپیہ کے نقصان سے بچانے کے لیے اپنا سو روپیہ کا نقصان کروا لینے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھے گا۔ (نوائے وقت، لاہور، ۱۲ جولائی ۱۹۹۲)

جاپان نے حریف سے ٹکراؤ کو چھوڑا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے یہاں اعلیٰ سائنسی معاشرہ وجود میں لا سکے۔ یہی دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد راستہ ہے۔

تین قسم

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک، ربانی عالم۔ دوسرے، وہ جو نجات کے راستہ کا طالب ہو۔ تیسرے، وہ ناکارہ اور پست لوگ جو ہر زور سے بولنے والے کے پیرو بن جائیں (الناس ثلاثۃ۔ عالمٌ ربانیٌّ۔ ومتعلم علی سبیلِ نجاۃٍ۔ وھمجٌ رعاعٌ اتباعُ کلِّ ناعقٍ) لسان العرب ۱/۴۰۴

عالم ربانی وہ ہے جو اپنے رب کو پا گیا ہو اور اس کی زندگی میں وہ اوصاف پیدا ہو گئے ہوں جو رب العالمین کی معرفت سے ایک آدمی کے اندر پیدا ہونے چاہئیں۔

دوسرا شخص وہ ہے جو سچا متعلم ہو۔ سچا متعلم بے فائدہ باتوں میں اپنا دماغ نہیں الجھاتا۔ وہ نجات اور فلاح کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور اس تلاش میں اپنی پوری توجہ لگا دیتا ہے۔

یہ دونوں قسم کے لوگ صحیح انسانی راستہ پر ہیں۔ وہ اپنے راستہ سے بھٹکے نہیں۔ وہ وہی سوچتے ہیں جو انھیں سوچنا چاہیے، اور وہی کر رہے ہیں جو انھیں کرنا چاہیے۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو حقیقت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ایک بات اور دوسری بات کا فرق نہیں جانتے۔ وہ سچے کلام اور جھوٹے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک اہمیت کی بات یہ نہیں ہوتی کہ کون شخص حق کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے بجائے ان کے یہاں ساری اہمیت اس کی ہوتی ہے کہ کون زیادہ زور سے چیختا ہے۔ کون زیادہ شاندار کلام کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کون زیادہ بڑے بڑے الفاظ بولنے کا کرتب دکھا رہا ہے۔

انسان کی یہ تینوں قسمیں پہلے بھی پائی جاتی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مزید شدت سے وہ پائی جا رہی ہیں خاص طور پر تیسری قسم کے انسان کی مثال موجودہ زمانہ میں عام ہو گئی ہے۔ اس کا ایک خاص سبب پریس ہے۔ پریس کے دور نے اس قسم کے لوگوں کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ پست اور ناکارہ ہونے کے باوجود غوغائی عمل کر کے شہرت حاصل کر لیں۔ اور پھر عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

حضرت علیؓ کا قول موجودہ حالات پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔

ذہنی تربیت

اسلام سے پہلے کے دور کو جاہلیت کا دور کہا جاتا ہے۔ جاہلیت سے مراد جہالت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بے خبری ہے۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب کے لوگ بے خبری کے دور میں تھے، اسلام نے ان کو باخبری کے دور میں پہنچا دیا۔ اسلام سے پہلے وہ بے شعوری کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ اسلام نے ان کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ باشعور زندگی گزار سکیں۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ لڑنے بھڑنے کو کمال سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اکثر لڑتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ صحیح اور غلط، اپنے اور غیر کی تفریق کے بغیر لوگوں نے لڑنے کو بذاتِ خود اپنا مقصود بنا لیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم ہی خود اپنے بھائی بنو بکر پر حملہ کر دیتے ہیں جبکہ لڑنے کے لیے کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا:

و احیاناً علیٰ بکرٍ أخینا اذا مالم نجد إلّا إخانا

اسلام نے ان کی ذہنی اور فکری تربیت کر کے ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی کہ وہ حق اور دوسرے میں فرق کریں۔ وہ حق کے پرستاروں اور حق سے بغاوت کرنے والوں کے درمیان تمیز کریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بتایا گیا کہ وہ منکرین پر سخت اور آپس میں نرم ہیں (اشداء علی الکفار رحماء بینھم) الفتح ۲۹

قرآن کی اس آیت کی تشریح شاہ عبدالقادر صاحب نے مختصر طور پر اس طرح کی ہے جو تندی اور نرمی اپنی خو ہو، وہ سب جگہ برابر چلے۔ اور جو ایمان سے نور کر آئے، وہ تندی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کس طرح آدمی کے ذہن کی تربیت کرتا ہے اور اس کے مزاج کو منفی رخ سے مثبت رخ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اسلام آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور غلط کے فرق کو سمجھے۔ وہ یہ جانے کہ کہاں بولنا ہے اور کہاں چپ رہنا ہے۔ کہاں لڑنا ہے اور کہاں برداشت کرنا ہے۔ کہاں اقدام کرنا ہے اور کہاں یہ کوشش کرنا ہے کہ اقدام کی نوبت نہ آئے۔

بامقصد تخلیق

یہ دنیا کیوں بنی۔ انسان کیوں یہاں پیدا ہوتا ہے۔ کس لیے وہ ایک خاص مدت کے بعد مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد کیا ہونے والا ہے ـــــ یہ سب سے زیادہ اہم سوالات ہیں جن پر ہر انسان کو سوچنا چاہیے۔ ان سوالات کا صحیح جواب معلوم کرنا بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ہزاروں برس سے انسان ان سوالوں کے بارہ میں سوچتا رہا ہے۔ مختلف لوگوں نے ان کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ تاہم بڑی تقسیم میں ان کو دو قسم میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جوابات جن کے مطابق، یہ سارا ہنگامہ عبث (المومنون ۱۱۵) اور بے مقصد ہے۔ اور دوسرا جواب وہ ہے جو یہ خبر دیتا ہے کہ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور اس کا ایک انجام ساتھ آنے والا ہے۔

پہلا جواب شاعروں، فلسفیوں اور دنیوی عالموں نے دیا ہے۔ دوسرا جواب ان ہستیوں کا دیا ہوا ہے جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے اور جس کا مستند متن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں پایا جاتا ہے۔

ان دونوں قسم کے جوابوں کے تقابل میں بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ مگر ایک بات بالکل واضح ہے۔ وہ یہ ہے پہلا جواب زندگی اور کائنات کے ڈھانچہ میں مطابق نہیں بیٹھتا۔ جب کہ دوسرا جواب زندگی اور کائنات کے نقشہ میں پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی اندرونی تضاد نہیں پایا جاتا۔

یہ دنیا جس کے اندر انسان پیدا ہوتا ہے وہ انتہائی بامعنی ہے۔ یہاں کوئی چیز بے معنی اور الل ٹپ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح انسان کا وجود بھی پوری طرح ایک بامعنی وجود ہے۔ اب یہ ناقابل قیاس ہے کہ ایک بامعنی انسان ایک انتہائی بامعنی کائنات میں پیدا کیا جائے مگر اس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ واقعہ اور توجیہہ کے درمیان یہ تضاد خود یہ ثابت کرتا ہے کہ واقعہ کی یہ توجیہہ درست نہیں۔ جہاں معنویت ہو وہاں مقصدیت بھی ضرور ہوگی۔ معنویت کبھی مقصد کے بغیر پائی نہیں جاسکتی۔ کائنات کا یہ پہلو پیغمبر کے جواب کی کھلی ہوئی تصدیق ہے۔

زلزلہ کی خبر

۲۱ جون ۱۹۹۰ کو ایران کے شمال مغربی علاقہ میں نہایت شدید بھونچال آیا۔ اس کی وجہ سے اس علاقہ کے ۸۰ ہزار سے زیادہ آدمی مر گئے اور ۲۰۰ ہزار سے زیادہ آدمی زخمی ہوئے۔ اس خبر کو پڑھ کر ایک صاحب نے کہا: یہ ایرانیوں کے اوپر خدا کا عذاب ہے۔

یہ ایک لغو بات ہے۔ اس دنیا میں جو حادثہ بھی پیش آتا ہے وہ اس لیے پیش آتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کے خوف سے کانپ اٹھیں، نہ یہ کہ وہ اس کو لے کر دوسروں کے خلاف تبصرے کرنا شروع کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زلزلہ کا تعلق نہ ایران سے ہے اور نہ خدائی عذاب سے۔ وہ ایک زمینی واقعہ ہے، اور وہ اس لیے ہے کہ لوگ اس سے نصیحت قبول کریں۔ ایران کے لوگ بھی، اور ایران کے باہر کے لوگ بھی۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۳ جون ۱۹۹۰) میں عالمی ایجنسیوں کے حوالے سے جو خبر دی گئی، اس میں بتایا گیا تھا کہ اس علاقہ میں ایک بھی مکان نہیں جو بھونچال کے بعد اپنی جگہ کھڑا ہوا ہو:

There is not a single house in the area that has been left standing.

یہی واقعہ ہر شدید زلزلہ کے بعد پیش آتا ہے۔ زلزلہ دراصل قیامت سے پہلے قیامت کی یاد دہانی ہے۔ وہ اس واقعہ کا چھوٹی سطح پر اظہار ہے جو قیامت کے دن زیادہ بڑی سطح پر پیش آئے گا۔

خدا نے اس دنیا کو عارضی امتحان کے لیے بنایا ہے۔ جب اس کی مدت ختم ہو گی تو خدا زمین کے اوپر شدید زلزلہ برپا کرے گا۔ اس کے نتیجہ میں انسان کی تمام تعمیرات ڈھ جائیں گی۔ انسان کا سارا تمدن کھنڈر ہو جائے گا۔ انسانی اقتدار کے تمام قلعے کامل طور پر منہدم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد خدا اپنی قدرت سے ایک نئی دنیا بنائے گا جہاں ہر ایک کو اس کے حقیقی عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔

زلزلہ کی خبر پڑھنے والا وہ ہے جس نے زلزلہ میں خود اپنی خبر پڑھی ہو۔ جو شخص زلزلہ کو دوسروں کا واقعہ سمجھے، اس نے ابھی تک زلزلہ کی خبر کو نہیں پڑھا۔

دوسرا لفظ

تاتاری قبائل چنگیز خاں کی رہنمائی میں ۶۱۶ھ میں مسلم دنیا پر حملہ آور ہوئے۔ پہلے انھوں نے عراق اور خراسان کو تباہ کیا۔ اس کے بعد وہ مزید بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کے زمانہ میں ۶۵۶ھ میں وہ بغداد میں داخل ہوئے اور انتہائی وحشیانہ طور پر عباسی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

مورخ عزالدین ابن الاثیر ۵۵۵ھ میں عراق میں پیدا ہوئے۔ ۶۳۰ھ میں عراق (موصل) ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ ابن اثیر نے مذکورہ تاتاری دور کے بڑے حصہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس طرح وہ اس دور کے عینی گواہ ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں ۶۱۷ھ کے واقعات کے تحت تاتاری فتنہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تاتاریوں کے عالم اسلام پر حملہ آور ہونے کا سبب یہ تھا کہ خراسان کے مسلم حکمراں خوارزم شاہ نے تاتاریوں کی ایک تجارتی جماعت کو قتل کروا دیا تھا۔ اس سے غصہ ہو کر انھوں نے حملہ کر دیا۔

پھر لکھتے ہیں کہ اسلامی ممالک کی طرف تاتاریوں کے خروج کا اس کے علاوہ اور سبب بھی بتایا جاتا ہے جس کو یہاں لکھا نہیں جا سکتا، پس جو ہوا سو ہوا، میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ تم اچھا گمان کر لو اور سبب نہ پوچھو (وقیل فی سبب خروجهم الی بلاد الاسلام غیر ذلك مما لا یذکر فی بطون الدفاتر)

فکان ما کان مما لستُ اذکرہ فظن خیرا ولا تسأل عن الخبرِ

(الکامل فی التاریخ ۱۲/۳۶۲)

ابن اثیر نے ۶۱۷ھ کے واقعات کے تحت دوسرے سبب کو چھپا دیا تھا۔ کیوں کہ اس کا تعلق بغداد کے خلیفہ ناصر لدین اللہ سے تھا اور وہ اس وقت زندہ تھا، تاہم ابن اثیر کو مزید عمر ملی۔ یہاں تک کہ ۶۲۲ھ میں ناصر لدین اللہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جب ابن اثیر نے ۶۲۲ھ کے تحت اپنی تاریخ کے صفحات لکھے تو اس میں انھوں نے وہ بات درج کر دی جس کا ذکر انھوں نے اس سے پہلے نہیں کیا تھا۔ ابن اثیر کے وہ بعد کے الفاظ یہ ہیں :

خلیفہ الناصر لدین اللہ نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر پائی اور ۴۶ سال سے زیادہ حکومت کی۔ اپنی عمر کے آخری تین سال وہ حرکت کے قابل نہیں رہا تھا، اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی اور دوسری آنکھ کی بصارت بہت کم ہو گئی تھی، اسی حال میں رمضان ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے ۲۸ سال بعد تاتاریوں نے بغداد کو تباہ کر دیا۔ ابن اثیر اس کی بعض نامحمود عادتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

فکان غرام الخلیفۃ بھذہ الاشیاء من اعظم الامور۔ وان کان سبب ماینسبہ العجم الیہ صحیحاً من أنہ ھو الذی اطمع التتر فی البلاد وراسلھم فی ذلک۔ فھو الطامۃ الکبری التی یصغر عندھا کل ذنب عظیم

(الکامل فی التاریخ ۱۲/ ۴۴۰)

پس ان چیزوں کی طرف خلیفہ کی رغبت بہت سنگین بات تھی۔ اور اگر وہ سبب صحیح ہو جو عجمی لوگ ناصر لدین اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ وہی تھا جس نے تاتاریوں کو مسلم علاقہ پر حملہ کے لیے ابھارا اور اس کے بارہ میں ان کے پاس پیغام بھیجا تو وہ اتنی بڑی مصیبت تھی کہ اس کے آگے ہر بڑا گناہ ہیچ ہے۔

ابن اثیر نے اپنی کتاب میں "دوسرا لفظ" لکھ کر اپنے "پہلے لفظ" کی تصحیح کر دی۔ لیکن اس دنیا میں اور بھی بہت سے "ابن اثیر" ہیں جو غلط طور پر "پہلا لفظ" لکھ دیتے ہیں۔ مگر اس کے بعد انھیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کی تصحیح کرتے ہوئے "دوسرا لفظ" تحریر کریں۔ ایسے لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ وہ اپنے قلم سے اگر دوسرا لفظ نہ لکھیں تب بھی ان کا دوسرا لفظ ضرور لکھا جانے والا ہے۔ مگر ایسی صورت میں یہ دوسرا لفظ لکھنے والا خدا کا فرشتہ ہوگا۔

جو شخص اپنا "دوسرا لفظ" خود لکھے، وہ پکڑ سے بچ گیا۔ لیکن جس آدمی کا "دوسرا لفظ" فرشتے لکھیں اس کے لیے خدا کی پکڑ سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

اسلامی مرکز کے تحت بیت المال قائم ہے۔ اس کی رقم مقرر مدوں میں خرچ کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات اور عطیات کی رقمیں اس کے لیے روانہ فرمائیں۔

سکریٹری اسلامی مرکز

لفظ کا فرق

الامام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴-۲۵۶ھ) کی کتاب صحیح البخاری حدیث کی مشہور ترین کتاب ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتابیں دو ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔ اور صحیح بخاری ان دونوں میں زیادہ صحیح ہے (اتفق العلماء علی أن اصح الکتب بعد القرآن الصحیحان: البخاری ومسلم وکتاب البخاری اصحھما) فتح الباری ۱/۵-۶

امام البخاری نے چھ سو ہزار (چھ لاکھ) حدیثوں کے ذخیرہ میں سے تقریباً ۷۰۰۰ حدیثیں منتخب کیں اور ان سے یہ مجموعہ تیار کیا ہے۔ مزید یہ کہ ہر حدیث کو لینے سے پہلے استخارہ کیا اور دو رکعت نماز پڑھی (صفحہ ۶) حتی کہ خواب میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور انھیں خصوصی طور پر اپنے مجموعہ احادیث کی صحت کے بارہ میں بشارت حاصل ہوئی۔ ایک شاعر نے کہا کہ امام بخاری نے جن حدیثوں کو اپنی کتاب میں جمع کیا ہے، گویا کہ انھوں نے ان احادیث کو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

کأنّ البخاری فی جمعہ تلقی من المصطفیٰ ما اکتسب

ان ساری خصوصیات کے باوجود صحیح بخاری غلطیوں سے پاک نہیں، چنانچہ علماء حدیث نے صحیح بخاری میں متعدد نہایت واضح قسم کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

مثال کے طور پر صحیح بخاری کی کتاب الجنائز کا ایک باب ہے: إحداد المرأۃ علی غیر زوجھا۔ یعنی عورت کا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور شخص کی موت پر سوگ منانا۔ اس باب کی دوسری حدیث یہ ہے:

عن زینب ابنۃ ابی سلمۃ قالت۔ لما جاءَ نَعیُ ابی سفیانَ من الشام دعت امُّ حبیبۃَ رضی اللہ عنھا بصُفرۃ فی الیوم الثالث فمسحتْ عارضَیھا وذراعَیھا وقالت۔ إنی کنتُ عن ھذا

زینب بنت ابی سلمہ کہتی ہیں کہ جب ابوسفیان کی موت کی خبر شام سے آئی تو ام حبیبہ رضؓ نے تیسرے دن ایک زرد خوشبو منگوائی۔ پھر اس کو اپنے دونوں رخساروں اور دونوں بازوؤں پر ملا اور کہا۔ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی مگر میں

لغنيةٌ لولا أني سمعتُ النبي صلى الله عليه وسلم يقول : لا يحلّ لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تُحِدّ على ميتٍ فوق ثلاث إلّا على زوج ، فإنها تُحِدّ عليه أربعةَ أشهرٍ وعشرا۔

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی عورت جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مُردہ شخص پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، سوا اپنے شوہر کے، کیوں کہ اس پر وہ چار مہینہ اور دس دن تک سوگ منائے گی۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوسفیان بن حرب کا انتقال شام میں ہوا۔ مگر یہ بیان واقعہ کے مطابق نہیں۔ کیوں کہ متفقہ روایات کے مطابق، حضرت ابوسفیان کا انتقال مدینہ میں ۲۱ ھ میں ہوا۔ جو واقعہ مدینہ میں پیش آیا، اس واقعہ کو اس روایت میں شام سے منسوب کیا گیا ہے (فتح الباری ۲/۷۶ ـ ۱۷۵)

اس فروگزاشت پر ردعمل کا ایک غیر سنجیدہ طریقہ ہے، اور دوسرا سنجیدہ طریقہ۔ غیر سنجیدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو شوشہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اور سنجیدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔

جو آدمی اس فروگزاشت کو شوشہ بنائے وہ اس کی بنیاد پر پوری صحیح بخاری کو مشتبہ قرار دے سکتا ہے۔ وہ امام بخاری کے علم کا مذاق اڑائے گا۔ وہ ان کے احتیاط کی روایتوں کو فرضی قصے قرار دے گا۔ وہ کہے گا کہ جب بخاری کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ ابوسفیان کا انتقال شام میں ہوا یا مدینہ میں تو ان کی مرتب کی ہوئی کتاب پر کیوں کر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے برعکس سنجیدہ آدمی اس کو ایک انسانی سہو قرار دے کر کہے گا کہ اس سے اصل کتاب پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ امام بخاری اس حدیث کو جس ترجمۂ باب کے تحت لائے ہیں، اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس سے ان کی منشا یہ بتانا ہے کہ کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی اور شخص کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے۔ اصل مدعا مذکورہ تسامح کے باوجود ثابت ہے۔ ابوسفیانؓ کی وفات مدینہ میں ہو تب بھی اور شام میں ہو تب بھی۔

ناقص، جامع

ایک شخص نے کہا کہ محبت نام ہے: "دل سے چاہنے کا" دوسرا آدمی بولا کہ تم نے محبت کا بہت ناقص مفہوم بیان کیا۔ محبت صرف دل سے چاہنے کا نام نہیں۔ محبت کا جامع تصور یہ ہے ـــــ دل سے چاہنا، جس سے محبت ہے اس سے ملنا، سلام و مصافحہ کرنا، اس کی تواضع کرنا، اس کی خدمت کرنا، اس کی خاطر دوسروں سے جنگ کرنا۔ اس کے نام کا ڈنکا بجانا، اس کا استقبال کرنا، وغیرہ۔

دوسرے آدمی کے نزدیک بظاہر اس کا اپنا تصورِ محبت جامع ہے اور پہلے شخص کا تصورِ محبت ناقص۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سوچ بجائے خود غلط ہے۔ محبت کے معاملہ میں جامع اور ناقص کی تقسیم نہیں۔ بلکہ حقیقی اور غیر حقیقی کی تقسیم ہے۔ آپ کو کسی آدمی سے قلبی تعلق ہو جائے تو کہا جائے گا کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ یہ محبت اگر سچی ہو تو مختلف مواقع پر اس کے تقاضوں کا ظہور ہوگا لیکن اگر قلبی محبت نہ ہو اور آدمی اوپری طور پر فہرستِ محبت کے مذکورہ افعال کرے تو وہ ظاہر داری ہوگی نہ کہ فی الواقع فہرستِ محبت کی تکمیل۔

یہی معاملہ دین کا ہے۔ "دین کا ناقص تصور" اور "دین کا جامع تصور" سراسر مبتدعانہ اصطلاحیں ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ اندازِ تعبیر قرآن اور حدیث میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اگر دین کے تصور کو بتانے کے لیے یہ کوئی صحیح تشریح ہوتی تو قرآن و حدیث میں ضرور یہ الفاظ پائے جاتے۔ مگر سارے قرآن میں کہیں بھی اس قسم کے الفاظ موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دین میں صحیح تقسیم حقیقی اور غیر حقیقی کی ہے۔ مطلوب دین داری وہ ہے جو اللہ سے تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔ اگر آدمی کے دل میں سچا تقویٰ پیدا ہو جائے تو آدمی کا پورا سلوک اسی کے رنگ میں ڈھل جائے گا۔ دین کی حقیقت اس کے تمام قول و فعل میں ظاہر ہوتی چلی جائے گی۔

اس کے برعکس اگر آدمی کے اندر قلبی تقویٰ پیدا نہ ہو تو وہ یا تو سرکش انسان ہوگا یا منافق انسان۔ سرکش انسان کھلم کھلا حکم الٰہی سے سرتابی کرتا ہے۔ اور منافق انسان اندر سے

خالی ہوتا ہے مگر اوپری طور پر دکھاوے والے اعمال کرتا ہے۔ مگر دینی حقیقت کے بغیر دینی ظاہر داری کی کوئی قیمت نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق (لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا) اللہ کسی شخص پر صرف اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا اس کو دیا ہے (لا یکلف اللہ نفسا الا ما آتاھا) دوسری جگہ فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے (فاتقوا اللہ ما استطعتم)

اس طرح کی ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی واجبات کا تعلق تمام تر حالات سے ہے۔ کسی مومن یا کسی مومن گروہ کی دینی ذمہ داری باعتبار استطاعت ہے نہ کہ باعتبار فہرست۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہر شخص کا دین ناقص نظر آئے گا، حتی کہ انبیاء کرام کا بھی۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اجتماعی احکام نافذ نہیں کیے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے نماز باجماعت قائم نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو والدین کے حقوق ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وغیرہ۔ اسی طرح ہر پیغمبر کا دین ناقص اور نامکمل قرار پائے گا۔ کیوں کہ کسی بھی پیغمبر کے یہاں فہرست کے اعتبار سے واجباتِ دین کے کامل نفاذ کی مثال موجود نہیں۔

دین کی اصل حقیقت اخلاص ہے۔ جس آدمی کے اندر اخلاص ہو وہ کامل دین پر ہے اور جس آدمی کے اندر اخلاص نہ ہو وہ ناقص دین پر۔

نیا انقلاب

برٹرینڈرسل نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک مذہب کا دور تھا۔ اس زمانہ میں انسان کوئی ترقی نہ کر سکا۔ انسان کی تمام ترقیاں حالیہ چند صدیوں میں ہوئی ہیں جب کہ مذہب کا غلبہ ختم ہو گیا اور سائنس کا دور دنیا میں شروع ہوا۔

برٹرینڈرسل کی یہ بات ایک ترمیم کے ساتھ صحیح ہے۔ قدیم زمانہ میں جو غلبہ تھا وہ حقیقی مذہب کا غلبہ نہیں تھا۔ بلکہ مشرکانہ مذہب (بالفاظ دیگر شرک) کا غلبہ تھا۔ یہی شرک ہے جو قدیم زمانہ میں تمدنی ترقیوں میں رکاوٹ بنا رہا نہ کہ حقیقی معنوں میں مذہب۔ حقیقی مذہب موحدانہ مذہب ہے، جب کہ قدیم تاریخ میں مشرکانہ مذہب ہمیشہ غالب رہا ہے۔

تمدنی ترقیاں فطرت کی تسخیر کا نتیجہ ہیں۔ قدیم زمانہ میں شرک فطرت کی چیزوں کو معبود کا مقام دیئے ہوئے تھا۔ ان چیزوں کو آدمی پرستش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کو تحقیق اور تسخیر کی نظر سے کیوں کر دیکھتا۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس نے تاریخ میں پہلی بار سچے مذہب (توحید) کو غلبہ کا مقام عطا کیا۔

توحید کے غلبہ کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کی چیزیں جو اس سے پہلے پوجنے کی چیز بنی ہوئی تھیں وہ اب تسخیر کی چیز بن گئیں۔ (وسخر لکم ما فی السموات والارض) پہلے اگر یہ نظریہ تھا کہ ہم چیزوں کے لیے ہیں تو اب یہ نظریہ ہو گیا کہ چیزیں ہمارے لیے ہیں نہ کہ ہم چیزوں کے لیے۔

برٹرینڈرسل نے جس انقلاب کو سائنس کی طرف منسوب کیا ہے، وہ انقلاب حقیقۃً سچے مذہب کا لایا ہوا ہے۔ اس کا بیج ساتویں صدی عیسوی میں اسلام (دین توحید) کے ذریعہ رکھا گیا نہ کہ سولھویں صدی میں یورپ کے نشأۃ ثانیہ کی صورت میں۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ تو خود اسلامی انقلاب سے متاثر ہو کر ظہور میں آئی۔

برٹرینڈرسل جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام اور دوسرے مذہب کا مطالعہ ایک ہی مشترک عنوان مذہب (ریلیجن) کے تحت کرتے ہیں۔ اگر وہ اس موضوع کا مطالعہ دو الگ الگ عنوانوں کے تحت کریں تو اس معاملہ کو سمجھنے میں انھیں دشواری پیش نہ آئے۔ محرف مذہب اور غیر محرف مذہب میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ دونوں کا مطالعہ ایک عنوان کے تحت نہیں جا سکتا۔

علم کی کسوٹی پر

بائبل میں آدم کے بعد انسانی نسل کا پورا شجرۂ نسب دیا گیا ہے۔ اس سے حساب لگا کر مسیحی علماء نے زمین پر آبادکاری کی مدت متعین کی ہے۔ یہ مدت ۱۹۷۵ میں ۵۷۲۶ سال تھی۔ دوسری طرف جدید علمی طریقوں سے زمین کی عمر اور اس پر آبادکاری کی مدت کا جو اندازہ کیا گیا ہے، اس کے مطابق یہ مدت مذکورہ اندازہ سے بہت زیادہ قرار پاتی ہے۔ اس اختلاف نے جدید علماء کی نظر میں بائبل کے بیان کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

اسی طرح بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ یعنی ۱۴۴ گھنٹہ والے چھ دنوں میں۔ یہاں بھی سائنس کی تحقیق بائبل کے بیان سے ٹکرا رہی تھی۔ کیوں کہ سائنسی مطالعہ کائنات کی تخلیق کو اربوں اور کھربوں سال کے درمیان پیش آنے والا ایک واقعہ بتا رہا تھا نہ کہ صرف ۱۴۴ گھنٹہ (چھ دن) کے اندر پیش آنے والا واقعہ۔ اس تضاد کی بنا پر جدید انسان کو بائبل علمی حیثیت سے ایک غیر معتبر کتاب نظر آنے لگی۔

علم اور مسیحیت کے درمیان اس طرح کے بہت سے ٹکراؤ پیش آئے۔ اس نے ابتداءً مسیحیت کو اور اس کے بعد تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر حقیقی ثابت کر دیا۔ اس نے مذہب کو توہماتی قیاسات کا مجموعہ سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔

اس ٹکراؤ نے ابتداءً تمام مذاہب کو جدید انسان کی نظر میں غیر معتبر بنا دیا۔ مگر موجودہ صدی کے نصف ثانی میں مزید تحقیق نے بتایا کہ یہ ٹکراؤ دراصل سائنس اور محرف مذہب کے درمیان تھا نہ کہ سائنس اور حقیقی مذہب کے درمیان۔

اس جدید تحقیق نے ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کے نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ ایک طرف دوسرے مذاہب ہیں جن کے متعلق واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ علمی لحاظ سے قابل اعتبار نہیں ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے بارہ میں یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ استثنائی طور پر دوسرے مذاہب سے الگ ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں کوئی بات بھی غیر علمی نہیں۔ وہ جس طرح سچا الہام ہے، اسی طرح وہ خالص علم کی جانچ میں بھی پورا اترتا ہے۔

فرد اور سماج

جو لوگ یک زوجگی کے حامی ہیں ان کا کہنا ہے کہ دوسری بیوی جب گھر میں آئے گی تو وہ شوہر میں اور اس کے اثاثہ میں حصہ دار بن جائے گی۔ عقد ثانی سے پہلے زوجۂ اول ہی شوہر کی اور اس کے اثاثہ کی تنہا حق دار ہوتی ہے۔ شوہر کی محبت، شوہر کا وقت، شوہر کی آمدنی، شوہر کی جائداد، ہر چیز کی وہ تنہا مالک ہوتی ہے۔ مگر دوسری بیوی جب گھر میں آئے گی تو وہ ہر چیز میں حصہ بٹائے گی۔ اس طرح گویا زوجۂ ثانی کی گھر میں آمد زوجۂ اول کی حق تلفی کا سبب ہے۔

مگر یہ نقطۂ نظر درست نہیں۔ یہ ان سماجی معیاروں (social norms) کے سراسر خلاف ہے جن کو تمام دنیا میں مسلمہ طور پر بنیادی اصول حیات کی حیثیت سے مان لیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ فرد کے حقوق سماج کے حقوق کے تابع ہیں۔ وہ سماج کے تقاضوں سے بالکل آزاد نہیں۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ تعدد ازواج ایک سماجی ضرورت ہے تو اس کے بعد اصولاً کسی عورت کو یہ حق نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنی انفرادی خوشی کے لیے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں یورپ میں وہ تحریک اٹھی جس کو فرد پسندی (individualism) کہا جاتا ہے۔ اس کے علم برداروں نے فرد کے لیے لامحدود آزادی کا مطالبہ کیا۔ مگر جلد ہی اس غیر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کے تلخ نتائج ظاہر ہوئے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اس کا ردعمل ظاہر ہوا اور وہ جوابی تحریک اٹھی جس کو اجتماع پسندی (collectivism) کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے حامیوں نے بتایا کہ فرد کو لامحدود آزادی دینا موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں ہے۔ فرد کی لامحدود آزادی نہ صرف سماج کے لیے مہلک ہے بلکہ آخری نتیجہ کے طور پر وہ خود فرد کی ترقی اور کامیابی میں رکاوٹ ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اب کوئی بھی شخص لامحدود فرد پسندی کا حامی نہیں۔ اب عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ فرد اور سماج کے حقوق کے درمیان توازن ہونا ضروری

ہے۔ اگر دونوں کی سرگرمیوں کے درمیان توازن موجود نہ رہے تو بالآخر دونوں ہی ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔

ایک شخص کو حق ہے کہ وہ سڑک پر اپنی گاڑی چلائے۔ مگر اس کو یہ حق نہیں کہ وہ دائیں اور بائیں دونوں طرف اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ اس کو بہر حال ایسا کرنا ہوگا اپنی گاڑی چلانے کے ساتھ دوسروں کی گاڑیوں کی رعایت کرے۔ ایک شخص کو بزنس کی اجازت ہے مگر سماج کے استحصال کی اجازت کسی کو نہیں دی جاسکتی۔ ایک شخص کو اپنی مطلوب چیز حاصل کرنے کا حق ہے۔ مگر جہاں دوسروں کا مطلوب متاثر ہونے لگے وہاں اس کو اپنی طلب کو حد میں رکھ کر دوسروں کو اپنی طلب پورا کرنے کا موقع دینا ہوگا۔

فرد پسندی ابتدائی طور پر ایک جائز چیز ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ فرد پسندی کو سماجی تقاضوں کے ماتحت رکھا جائے نہ کہ اس سے آزاد۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی کمائی پوری کی پوری اس کی ملکیت ہو۔ مگر سماجی ضرورتوں کی بنا پر اس کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ بطور ٹیکس ادا کرے۔

مذکورہ بنیادی قاعدہ کو سامنے رکھا جائے تو تعدد ازدواج کا اصول کوئی منفرد اصول نہیں، یہ عین وہی اصول ہے جو عملاً زندگی کے تمام دوسرے شعبوں میں ہمیشہ رائج رہا ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ یہ مانا گیا ہے کہ فرد پر لازم ہے کہ وہ سماج کے مسائل میں حصہ دار بنے۔ اس اصول کے مطابق کسی مرد کی زوجۂ اول کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ سماج کے مسائل میں شرکت سے انکار کرے۔ اس قسم کے دوسرے کئی اشتراک کو وہ پہلے ہی سے قبول کیے ہوئے ہے۔ پھر ایک اور اشتراک سے انکار کرنے کا اسے کیا حق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سماج کا فرد ہونا ہی کسی مرد یا عورت پر یہ ذمہ داری ڈال دیتا ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو اس حد تک نہ لے جائیں کہ وہ اجتماعیت کے تقاضوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ دوسری بیوی پر راضی ہونا مخصوص حالات میں، پہلی بیوی کے لیے ایک سماجی مسئلہ میں اشتراک کے ہم معنی ہے۔ اور پہلی بیوی کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس اشتراک کو دل کی آمادگی کے ساتھ قبول کرلے۔

تعدد ازدواج کا مسئلہ ایک قانون کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ قانون جو وضع کیے جاتے ہیں وہ کس اصول کے تحت وضع کیے جاتے ہیں۔

قانون ایک اعتبار سے، فرد اور سماج کے حقوق متعین کرنے کا نام ہے۔ قانون عین اپنے اساسی مفہوم کے اعتبار سے فرد کی ان سرگرمیوں کی حد بندی کرتا ہے جو سماج کے دوسرے افراد کے لیے مضر ہیں یا مضر ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے تو قانون ایسے فرد کے لیے ایسی سزا مقرر کرتا ہے جس سے سماج کی داد رسی ہو سکے۔

قانون کے اس تصور کے مطابق، تعدد ازدواج کا اصول قانون کی منشا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ قانون کی روح یہ ہے کہ نہ صرف ایک فرد کو بلکہ پورے سماج کو زندگی کے مواقع حاصل ہوں۔ اس کے مطابق، جب سماج میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے اور مردوں کی تعداد کم، تو یہ عین سماجی تقاضا بن جاتا ہے کہ اس مسئلہ کو شریفانہ طریقہ پر حل کیا جائے۔ اور اس مسئلہ کا شریفانہ حل، بلاشبہہ، وہی ہے جس کو تعدد ازدواج کہا جاتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ سماج کی خاطر اس ذمہ داری کو قبول کریں جس طرح وہ دوسری ذمہ داریوں کو سماج کی خاطر قبول کیے ہوئے ہیں۔

حق کی حیثیت یہی ہے۔ دعوت حق لوگوں کو جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کرنا چاہتی ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے سلفی مفکرین نے دعوت کو بھی چھیننے کا ایک معاملہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے دعوت کی تعبیر سیاست کے انداز میں کی۔ انھوں نے دعوت کا مطلب یہ بتایا کہ اقتدار پر قبضہ کر کے اسلامی قانون کو زمین پر نافذ کیا جائے۔ دعوت اسلامی کی یہ تعبیر مجرمانہ حد تک غلط ہے۔ اس کے نتیجہ میں داعی اور مدعو کے درمیان غیر ضروری سیاسی نزاع قائم ہو گئی۔ وہ ربانی مہم جو دراصل دینے کی مہم تھی، وہ بالکل غلط طور پر چھیننے کی مہم بن کر رہ گئی ہے۔

عربوں کی ایک مجلس میں مسلمانوں کے کردار پر گفتگو ہو رہی تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ موجودہ مسلمانوں میں کردار کی بہت کمی ہو گئی ہے، اس لئے ان کے درمیان کوئی بڑی مہم کامیاب نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ کردار، کردار کہنے سے کردار پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح درخت، درخت کہنے سے درخت نہیں اگتا۔ درخت بیج بونے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی انسانی کردار کا معاملہ بھی ہے۔ انسانی کردار کا ایک بیج ہے، اور وہ بیج مقصد ہے۔ مقصد کا شعور ہی آدمی کے اندر وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کرتا ہے جس کو کردار کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ مقصد جتنا زیادہ بڑا ہوگا، کردار بھی اتنا ہی بڑا بنے گا۔ موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے مقصد کا احساس کھو دیا ہے، اس لئے وہ کردار بھی کھوئے ہوئے ہیں:

بقدر ما یکون الهدف عظیما فسوف تکون الاخلاق عظیمة. ان اکبر مشکلة فی المسلمین المعاصرین انهم قد فقدوا الهدف العظیم لهذا انهم قد فقدوا الاخلاق العظیمة

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ آجکل مسلمانوں کے جس اجتماع میں جائیے یا جس مجلس میں بیٹھئے، ہر جگہ "اعداء اسلام" کے بارہ میں باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ طرز فکر سطحی بھی ہے اور خلاف اسلام بھی۔ اگر موجودہ صورت حال کو خالص عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے ساتھ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کی اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ اور اگر اس کو دینی اعتبار سے جانچا جائے تو یہ خدا کی طرف سے انتباہ ہے تاکہ مسلمان جاگیں اور اپنی دینی کوتاہیوں کو دور کریں۔ مگر ان چیزوں کو اعداء اسلام کے خانہ میں ڈالنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ صورت حال سے مسلمانوں کے اندر

نہ تعمیر خویش کا جذبہ ابھرا اور نہ دینی احتساب کا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز فکر مکمل طور پر شیطان کا وسوسہ ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ مسلمان جھوٹی شکایتوں میں کھوئے رہیں اور اپنی اصلاح کی طرف سے غافل ہو جائیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ فرد ہے نہ کہ جماعت۔ حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال جیسے اعمال بھی ہیں جو کہ سراسر اجتماعی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ اسلام میں دعا اور عبادت سے لے کر جہاد و قتال تک ہر عمل ذاتی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق کسی عمل کی قیمت عامل کی نیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے عمل کو اندرونی نیت کے معیار پر جانچا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر عمل، اپنے آخری تجزیہ میں، ذاتی اور شخصی عمل ہے۔ کسی عمل کا اجتماعی پہلو اس کا اضافی پہلو ہے نہ کہ اس کا حقیقی پہلو۔

ایک صاحب نے پر جوش تقریر کی۔ ان کی عربی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اعداء اسلام صرف طاقت سے ڈرتے ہیں، اور طاقت ہی کے ذریعہ ان کو شر انگیزی سے روکا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم طاقت فراہم کریں۔ ان کے نزدیک یہی دعوت اسلامی کا سب سے بڑا نکتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دعوت اس کا نام ہے کہ امت کو طاقت ور بننے کی طرف متوجہ کیا جائے (الدعوۃ ھی توجیہ الامۃ الی القوۃ)۔ اس تقریر کو سن کر مجھے نظیر اکبر آبادی کا شعر یاد آگیا:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

ایک شخص بھوکا ہو تو اس کو چاند سورج بھی روٹی کی صورت میں دکھائی دیں گے۔ یہی حال موجودہ مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ مسلمانوں پر "دشمن" کا تصور اتنا چھا گیا ہے کہ ان کو ہر طرف بس دشمن کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ حتی کہ انھوں نے اسلام کو اپنے اسی ذہنی نقشہ میں ڈھال لیا ہے۔ قرآن و سنت میں وہ "دعوت" کا لفظ دیکھتے ہیں تو فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ اس کا مطلب جنگی طاقت بننے کی دعوت ہے

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اختلاف موجودہ دنیا کا ایک ناگزیر ظاہرہ ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گا۔ ہمارا اصل کام حالتِ اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، کیوں کہ وہ ممکن نہیں۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنائیں کہ وہ اختلاف کو پر امن دائرہ میں حل کرنے کی کوشش

کریں۔ موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے برداشت کو کھو دیا ہے۔ اختلاف پیدا ہوتے ہی فوراً وہ جارحیت پر اتر آتے ہیں۔

میں نے کہا کہ روس اور امریکہ کے درمیان اختلاف تھا۔ دونوں کے پاس انتہائی طاقتور ہتھیار موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ سختی کے ساتھ اس پر قائم ہیں کہ ہر اختلاف کو میز پر طے کرنے کی کوشش کریں۔ خلیج میں عراق اور کویت کے درمیان اختلاف تھا۔ عراق کے پاس اتفاق سے کچھ طاقت آگئی۔ اس نے فوراً کویت کے خلاف فوجی اقدام کر دیا۔ دوسری طرف اسی معاملہ میں امریکہ کو عراق سے شدید ترین اختلاف ہے۔ وہ اپنی فوجیں لئے ہوئے خلیج میں کھڑا ہوا ہے۔ مگر کئی مہینے گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس نے عراق پر فوجی حملہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کے اسی مزاج نے انھیں موجودہ دنیا میں برباد کر رکھا ہے۔

اخوانی طرز فکر کے کچھ عربوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے گفتگو کے دوران مصر کے لیڈر سید قطب کا ذکر آیا۔ اخوانی حلقہ سید قطب کی بے حد تعظیم کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے سید قطب کو پڑھا ہے۔ میں نے ان کے یہاں علم اور گہرائی نہیں پائی۔ یہ دراصل جمال عبد الناصر تھے جنھوں نے ان کو بلند کر دیا۔ ناصر نے ان کو قطب سے شہید قطب بنا دیا۔ ناصر نے اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہوتا تو وہ ایک عام آدمی بن کر رہ جاتے۔ مگر جب ناصر نے ان کو قتل کر دیا تو انھوں نے ان کو ہیرو بنا دیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دے کر بھٹو کو ہیرو بنا دیا:

قد قرأت لسید قطب۔ فما وجدت عنده علما او عمقا۔ انما هو جمال عبد الناصر الذی رفعه، فصنعه من قطب الی الشهید قطب۔ لو ترکه لمات کشخص عادی ولکن لما قتله جعله بطلا، کما ان ضیاء الحق جعل بوتو بطلا بمثل هذا العمل

کچھ عربوں سے میری ذاتی زندگی کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ میری زندگی کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ دنیوی معاملہ میں میں نے جو کچھ چاہا، عملاً میرے ساتھ اس کے خلاف معاملہ کیا گیا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میری مثال اردو شاعر فانی بدایونی کے اس شعر کی سی ہے:

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

طمعی کان علی استعداد لقبول نعیم العالمین، انه لکرم منك ان وهبتنی قلباً حزیناً

یہاں سیکڑوں لوگ جمع تھے اور سب دین کے نام پر یہاں آئے تھے۔ مگر میں نے کسی نشست میں لوگوں کی زبان سے موت اور آخرت کی بات نہیں سنی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ لوگوں کو اس حقیقت کبریٰ کا علم ہی نہیں۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ عربی شاعر نے کہا تھا : ستبدی لك الايام ماكنت جاهلا (زمانہ تم کو عنقریب وہ چیز بتا دے گا جس سے تم بے خبر تھے) شاعر نے یہ بات دنیوی معنی میں کہی تھی۔ مگر یہی بات زیادہ شدت کے ساتھ موت اور آخرت کے بارہ میں صحیح ہے۔ جب موت آئے گی اور جب قیامت برپا ہوگی تو لوگ اچانک ان باتوں کو اپنے سامنے دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائیں گے جن کی آج انھیں خبر دی جا رہی ہے۔ مگر وہ بے پروائی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کے خیال کے مطابق ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ وہ کچھ اور نوجوانوں کے ساتھ ایک خفیہ تحریک چلا رہے تھے تاکہ حکومت کا تختہ الٹ سکیں۔ کئی سال کی کوششوں کے بعد جب انھیں کامیابی نہیں ملی تو انھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ خودکشی کر لیں۔ عین اسی زمانہ میں انھیں انگریزی الرسالہ اور عربی کتابیں مل گئیں۔ ان کا مطالعہ کرتے ہی ان کا ذہن بدل گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اب مجھ کو نئی زندگی حاصل ہو چکی ہے۔ انھوں نے اسلامی مرکز کے مشن کے بارہ میں کہا :

ان هذه الدنيا مثل الصحراء ولا يوجد بها اى شيئ۔ وهذه الرسالة هى مثل الشجرة۔ فلا يوجد اى شيئ غيرها۔ فيجب ان نقوم لهذه الرسالة بكل قوة۔

ایک عرب جو اخوانی فکر کے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ امراء المسلمین سے سیاسی نزاع کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ حالاں کہ امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر محدث نے عباسی حکومت سے نزاع کی۔ میں نے کہا کہ آپ کا حوالہ درست نہیں۔ امام احمد نے کبھی بھی عباسی حکومت سے سیاسی نزاع نہیں کی۔ یعنی انھوں نے کبھی یہ مہم نہیں چلائی کہ وہ عباسی خلافت کو توڑ کر نیا سیاسی نظام بنائیں۔ ان کا اختلاف صرف ایک مخصوص اعتقادی مسئلہ میں تھا۔ اس کے آگے ان کا کوئی سیاسی مطالبہ نہیں تھا۔

یہ اسی قسم کا ایک واقعہ تھا جو ہندستان میں پیش آیا۔ ہندستان کی سپریم کورٹ نے ایک مسلم

مطلقہ عورت کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ وہ اپنے سابقہ شوہر سے ماہانہ نفقہ حاصل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ فیصلہ ملکی قانون کے تحت دیا گیا تھا۔ مگر وہ شریعت کے خلاف تھا۔ علما نے اس کے خلاف خالص غیر سیاسی انداز میں ایک مہم چلائی۔ یہاں تک کہ حکومت نے نیا ایکٹ بنا کر مسلم مطلقہ عورتوں کو اس ملکی قانون سے مستثنیٰ قرار دیدیا۔ اسی پر امام حنبل کے معاملہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان پر بے اختیار یہ فقرہ آگیا ـــــ آہ، وہ لوگ جو جہنم کے قابل بھی نہیں، مگر وہ امیدوار ہیں کہ ان کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔ انھیں جنت کے باغوں میں داخل کیا جائے گا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ کو ایک واقعہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے کچھ عرب نوجوانوں سے کہا کہ قرآن کا ایک اسلوب یہ ہے کہ ایک آیت میں بظاہر ایک متعین بات کہی جاتی ہے۔ مگر وہ دراصل ایک کلیہ کا جزئی انطباق ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا (البقرہ ۱۰۶) ظاہر الفاظ کے اعتبار سے یہاں صرف نسخ آیت کا ذکر ہے۔ مگر وسیع تر معنوں میں وہ اللہ تعالیٰ کے ایک عمومی قانون کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں جب بھی کسی صورت حال کو بدلا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ کسی نئی بہتر صورت کو لایا جائے۔ اس اعتبار سے قرآن کی مذکورہ آیت کی تفسیر کی جائے تو وہ اس طرح ہوگی:

ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ اذا اراد ان یغیر الاحوال فما یغیرہا الا ویأتی بما ہو احسن منہ۔ ہذا ہو الاسلوب الالٰہی۔ وکذالک فعل فی القرآن فقال (ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا)

ایک مجلس میں کچھ واقف کار عربوں نے میری ذات کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ جو اسلامی مشن میں چلا رہا ہوں، اگر میں اس کو دریافت نہ کرتا تو میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک صاحب نے اس کو سن کر پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ میں فطری طور پر ایک کمال پسند (perfectionist) آدمی ہوں۔ کمال سے کم (less than perfect) پر راضی ہونا میرے لئے ممکن نہیں۔ جب میں سن شعور کو پہنچا تو میں نے اپنے آپ کو دو چیزوں کے درمیان پایا۔ ایک مادی دنیا۔ دوسرے تقلیدی مذہب، موجودہ دنیا

کی ہر چیز کمال سے کم ہے۔ کمال (perfect) کا حصول صرف آخرت میں ممکن ہوگا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو دنیا پر راضی نہ کر سکا۔ تقلیدی مذہب انسانی ملاوٹوں کا مذہب ہے۔ سچا مذہب فکری اعتبار سے کامل ہوتا ہے۔ مگر انسانی ملاوٹ نے تقلیدی مذہب کو کمال سے کم بنا دیا ہے۔ چنانچہ میں اس پر بھی راضی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اللہ کی توفیق سے میں نے اس دین کو دریافت کیا جو ابتداءً پیغمبر پر اترا تھا اور پوری طرح کمال کی صفت رکھتا تھا۔ اس دریافت نے میرے لئے زندگی کو ممکن بنا دیا۔

۳۰ ستمبر کی شام کو لیبیا کا ایک زراعتی فارم (المزرعۃ) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ طرابلس شہر سے ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ فارم کے پرسکون ماحول میں چند گھنٹے گزارے۔

لیبیا کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ مگر یہاں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں پانی کی وہ فراوانی نہیں ہے جو ہندستان میں ہے۔ یہاں کی زمین میں ہر قسم کی عمدہ فصل اگانے کی صلاحیت ہے۔ بشرطیکہ پانی وافر مقدار میں ملنے لگے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ لیبیا میں کچھ زراعتی بیماریاں پھیل گئی ہیں۔ یہ خاص طرح کے کیڑے ہیں جو ہوا میں سفر کر کے اِدھر سے اُدھر پہنچتے رہتے ہیں۔ وہ درخت کی لکڑی کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کو کھاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ درخت سوکھ جاتا ہے۔ میں نے یہاں کئی درخت دیکھے جو جزئی یا کلی طور پر سوکھ گئے تھے۔

ایک مغربی ماہر نے ان کیڑوں کو ختم کرنے کا منصوبہ دیا ہے۔ مگر اس پر عملدرآمد کے لئے ایک سو ملین ڈالر کی ضرورت ہوگی۔

تاہم بعض درختوں پر ان کیڑوں کا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً فارم کے اندر کھجور کے چھوٹے بڑے درخت تھے۔ مگر وہ مکمل طور پر سرسبز و شاداب تھے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ اخلاقی اور دینی بیماریاں صرف ان لوگوں کو نقصان پہنچاتی ہیں جو ان سے متاثر ہونے کا مزاج رکھتے ہوں۔ جن کے اندر تاثر کا مزاج نہ ہو وہ اخلاقی بیماریوں کے ہجوم میں بھی اس سے محفوظ رہیں گے۔

ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جو لوگ اسلام کی تشریح سیاسی انقلاب کی اصطلاحوں میں کرتے ہیں، انھوں نے بہت بڑی جسارت کی ہے۔ انھوں نے بطور خود اللہ کے منصوبہ کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کے منصوبہ کے مطابق، یہ دنیا پوری کی پوری دار الامتحان ہے۔ ایک شخص گھر میں ہو یا بازار میں، تنہا ہو یا دوسروں کے ساتھ ہو۔ وہ عام انسان کی حیثیت میں ہو یا وہ

ملک کا حکمراں بن جائے، ہر جگہ وہ حالت امتحان میں ہے۔ مگر مذکورہ سیاسی تفسیر کے مطابق، حکومت مطلوب حالت قرار پاتی ہے اور غیر حکمرانی کی حالت غیر مطلوب حالت۔

اسکول کے ایک طالب علم کا امتحان ہو تو اس کو کئی پرچے دئے جاتے ہیں جن کا تعلق مختلف موضوعات سے ہوتا ہے۔ مثلاً زبان، تاریخ، سماجیات، سائنس وغیرہ۔ ان میں سے ہر پرچہ بذات خود مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو جو احوال ملے ہوں، وہی احوال اس کے لئے مطلوب احوال ہیں اور انھیں احوال میں اس کو اپنا امتحان دینا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تعبیر آدمی کے اندر سے محرک عمل چھین لیتی ہے (هذا التفسير يسلب من الانسان الدافع للعمل) اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص قرآن میں انفاق کا حکم دیکھتا ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو۔ اب اگر ایک شخص یہ سمجھے کہ کم یا زیادہ جو بھی میرے پاس ہے، اس میں سے مجھے خرچ کرنا ہے تو حکم کو پڑھتے ہی اس کے اندر انفاق کی نفسیات پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو موٹر کار کا عطیہ دو، تو عام انسان کے اندر انفاق کی نفسیات نہیں ابھرے گی۔ کیوں کہ وہ اس معنی میں انفاق کے حکم پر عمل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

یہی حال سیاسی تفسیر کا ہے۔ یہ تفسیر آدمی کے اندر عمل کے بجائے انتظار اور توقف کی نفسیات پیدا کرتی ہے۔ اس کے مطابق، اصل عمل کا آخری آغاز اس وقت ہوگا جب کہ حکومت پر قبضہ ہو جائے۔ اس لئے وہ حکام سے ٹکراؤ کی نفسیات تو ابھارتی ہے مگر ذاتی عمل کی نفسیات نہیں ابھارتی۔ هذا التفسير يُنبت في الانسان نفسية محاسبة الحكام لا نفسية محاسبة الذات۔

ہندستان اور پاکستان کے لوگ یہاں کافی تعداد میں ہیں۔ انھوں نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۰ کو طرابلس کے ایک ہال میں سیرت النبی کا جلسہ کیا۔ اس موقع پر مجھے خطاب کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ میں نے جلسہ سے خطاب کیا۔ اس جلسہ میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی شریک ہوئے۔ سفیر ہند مسٹر گلیانی بھی موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام وقتی نہیں تھا۔ اس کا تعلق (relevance) عصر حاضر کے لئے بھی پوری طرح موجود ہے۔ عصر اور مغرب کے

درمیان تقریر ہوئی۔ مغرب کی نماز کے بعد سوال وجواب کی نشست ہوئی۔ یہ دوسری نشست صرف مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

زیادہ تر سوال ہندستان کے مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں کیا گیا۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک ہندستان کا معاملہ وہی ہے جو ساری دنیا کا معاملہ ہے۔ خواہ ہندستان ہو یا لیبیا یا پاکستان یا سعودی عرب یا یورپ اور امریکہ، ہر جگہ کامیاب زندگی گزارنے کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ برداشت اور ٹالرنس ہے۔ کسی بھی ملک میں اگر آپ کامیاب ہیں تو اس لئے کامیاب ہیں کہ وہاں آپ برداشت کر کے رہتے ہیں۔ اور جہاں آپ بظاہر ناکام ہیں وہاں اسی لئے ناکام ہیں کہ وہاں آپ نے برداشت کو کھو دیا ہے۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۰ کو طرابلس سے پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ۷۲۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ حیرت انگیز طور پر اس کے اندر بہت کم مسافر تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر جہاز کے چاروں طرف دیکھا تو سیٹوں پر اتنے کم آدمی تھے کہ ایسا معلوم ہوا کہ گویا جہاز خالی حالت میں اڑ رہا ہے۔ میں نے جہاز کے عملہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیٹیں بالقصد خالی رکھی گئی ہیں۔ کویت اور عراق میں کام کرنے والے لاکھوں پاکستانی جو کویت پر حملہ کے بعد بھاگ کر اردن آ گئے تھے، ان کو روزانہ عمان سے پاکستان لے جایا جا رہا ہے۔ ان پناہ گزینوں کی خاطر یہ سیٹیں خالی رکھی گئی ہیں۔ مزید یہ کہ عمان میں جہاز کا اترنا خصوصی معاملہ کے طور پر ہے۔ کیوں کہ عام قاعدہ کے مطابق یہ جہاز عمان میں نہیں اترتا۔

میں نے سوچا کہ ان پاکستانیوں کی وہ کیا خصوصیت ہے جس نے ان کے اندر یہ قیمت پیدا کر دی کہ ان کے لئے خالی جہاز بھیجے جائیں۔ ذہن نے کہا کہ اس کی وجہ ان پاکستانیوں کی مظلومیت ہے۔ کبھی دولت اور اقتدار سے آدمی کے اندر قیمت پیدا ہوتی ہے۔ کبھی آدمی کا عاجز اور مظلوم ہونا اس کے اندر وہی قیمت پیدا کر دیتا ہے جو عام حالات میں قوت و طاقت کے ذریعہ کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔

یہ سوچ کر دل بھر آیا۔ میں نے کہا کہ خدایا، میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میرے پاس طاقت والی چیزوں میں سے کوئی چیز موجود نہیں۔ میرے پاس صرف عجز ہے۔ تو میرے عجز کو قبول فرما۔ ایک عاجز کے لئے وہ فیصلہ فرما دے جو عام حالات میں صرف طاقتور کا حق سمجھا جاتا ہے۔

جہاز میں پاکستانی اخبارات (نوائے وقت، جنگ، جسارت، دی نیشن) پڑھ رہا تھا۔ اس دوران یہ آیت یاد آئی: یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون (القلم ۴۲)

میں نے کہا کہ اس آیت میں "سجدہ" کا لفظ علامتی طور پر آیا ہے۔ اصل میں یہ محرومی کا ایک وسیع تجربہ ہے جو آدمی کے اوپر قیامت میں گزرے گا۔ مالک کائنات اپنے تمام جلال و کمال کے ساتھ انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ اس وقت آدمی خدا کو دیکھنا چاہے گا مگر وہ اس کو نہ دیکھ سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں وہ خدا کو دیکھنے کے لئے اندھا بنا رہا۔ وہ خدا کی حمد کرنا چاہے گا مگر وہ اس کی حمد نہ کر سکے گا، کیوں کہ دنیا میں خدا کی حمد کرنے سے اس کی زبان گونگی ہو گئی۔ وہ خدا کی باتوں کو سننا چاہے گا مگر وہ اس کو نہ سن سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں خدا کی باتوں کو سننے کے لئے اس نے اپنے کان بند کر لئے تھے۔ وہ چاہے گا کہ اپنے رب کی عظمت کے اعتراف میں اس کے آگے جھک جائے مگر وہ اس کے آگے نہ جھک سکے گا، کیوں کہ دنیا میں وہ اس کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

روزنامہ جنگ (۳ اکتوبر ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر وزیر اعظم پاکستان غلام مصطفی جتوئی کی ایک تقریر درج تھی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ لوگوں کو کوئی چیز "احتساب سے نہیں بچا سکتی"۔ اور یہ کہ "۲۴ اکتوبر ان کے لئے یوم حساب ثابت ہوگا"۔ اسی خبر کا عنوان روزنامہ جسارت (۳ اکتوبر) میں یہ تھا: کوئی سازش بدعنوانوں کو احتساب سے نہیں بچا سکتی۔

میں نے سوچا کہ پاکستان کا ۲۴ اکتوبر (الکشن) وہ یوم حساب ہے جو انسان صرف اپنی محدود طاقتوں کے ذریعہ برپا کر سکتا ہے۔ ایسے یوم حساب سے بچ نکلنا بہت آسان ہے۔ جیسا کہ سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے احتساب کے باوجود پیپلز پارٹی دوبارہ زندہ رہی۔ مگر انسان پر ایک اور یوم حساب آنے والا ہے۔ اس سے کوئی شخص بھی بچ نہ سکے گا۔ حتی کہ صدر اور گورنر اور وزیر اعظم بھی نہیں۔

چوں کہ پاکستان میں الکشن قریب ہے، اس لئے ہر لیڈر بے تکان بول رہا ہے۔ تمام اخبارات لیڈروں کے بیانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر ایک اپنے کو صحیح اور دوسرے کو غلط ثابت کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج ہر آدمی کے پاس الفاظ ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ کسی کے پاس الفاظ نہیں ہوں گے۔ اس وقت صرف وہ شخص بول سکے گا جو دنیا میں خدا کے خوف سے چپ ہو گیا تھا۔ اس دن صرف اس شخص کو چلنے کی سعادت حاصل ہوگی جس کے قدم خدا کی عظمت کے احساس

سے موجودہ دنیا میں رک گئے تھے۔

جسارت کے صفحہ اول کی ایک خبر کی سرخی یہ تھی: نواز شریف نے ملکی سیاست کو لسانی اور گروہی سیاست کی نذر کر دیا ہے ـــــ جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ کی قرارداد۔ نواز شریف صاحب اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر ہیں، اور جماعت اسلامی اس اتحاد میں پوری طرح شامل ہے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف اخبار میں اس قسم کے بیان چھپ رہے ہیں۔ اس خبر کو میں نے پڑھا تو میری زبان پر یہ الفاظ آ گئے: وہ اتحاد بھی کیسا عجیب اتحاد ہوگا جو ملک کو گروہی سیاست کے خانوں میں بانٹ دے۔

شام کو جہاز دمشق پہنچا۔ جہاز سے اتر کر کچھ وقت دمشق کے ہوائی اڈہ پر گزارا۔ مغرب کی نماز بھی جماعت کے ساتھ دمشق کے ہوائی اڈہ پر پڑھی۔

دمشق کا نام سب سے پہلے میں نے غالباً دس سال کی عمر میں سنا جب کہ مولانا فیض الرحمان اصلاحی (وفات ۱۸ فروری ۱۹۷۲) کے ذریعہ میں نے شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲-۱۲۱۳ء) کی فارسی کتاب بوستاں پڑھی۔ یہ منظوم کتاب اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک حکایت اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس نظم میں دمشق کے ایک قحط کا ذکر ہے جس میں عشق کرنے والے اپنا عشق بھول گئے تھے۔ شیخ سعدی نے قحط کی تصویر کشی کرتے ہوئے جو اشعار لکھے ہیں، ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

نہ بر کوہ سبزہ نہ در باغ شخ ملخ بوستاں خورد و مردم ملخ

(نہ پہاڑ پر ہریالی باقی رہی اور نہ درخت پر شاخ، ٹڈیاں باغ کو کھا گئیں اور لوگوں نے ٹڈیوں کو)

دمشق ایک ایسا شہر ہے جو اسلامی قافلہ کے سفر کے تیسرے مرحلہ کی یاد دلاتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، امیر معاویہؓ نے دمشق کو اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا۔ یہاں سے اسلام کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا۔ اس وقت کہ اسلامی دعوت کا مرکز تھا ۶۲۲ء میں ہجرت ہوئی اور مدینہ اسلام کا مرکز قرار پایا۔ بنو امیہ کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو انھوں نے ۶۶۱ء میں دمشق کو اسلام کے مرکز کی حیثیت دے دی۔ ۷۵۰ء میں بنو عباس اسلامی اقتدار پر قابض

ہو گئے اور انھوں نے بعض سیاسی اسباب کے تحت بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنانا پسند کیا جو ۱۲۵۸ء تک باقی رہا۔

اس کے بعد کئی نسبتاً چھوٹے اسلامی مراکز بنے۔ عبدالرحمٰن اموی ۷۵۶ء میں اسپین میں داخل ہوا اور یہاں اس شاندار عہد کا آغاز کیا جس کو "مسلم اسپین" کہا جاتا ہے۔ یہ دور ۱۴۹۲ء میں آخری طور پر ختم ہوا۔ اس درمیان میں مختلف چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے دو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایک، عثمانی خلافت جس کا مرکز استنبول تھا۔ یہ ۱۳۰۰ء کے بعد شروع ہوئی اور چھ صدیوں تک شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی۔ ۱۹۲۴ء میں کمال اتاترک کے الغاء خلافت کے اعلان سے رسمی طور پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسری، مغل سلطنت ہے جو بابر کے فتح دہلی ۱۵۲۶ء سے باقاعدہ طور پر قائم ہوئی اور ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر پر ختم ہو گئی۔

شام ایک عرب ملک ہے، جس طرح سعودی عرب اور کویت عرب ملک ہیں۔ مگر سعودی عرب اور کویت پٹرول کے خزانوں سے مالا مال ہیں، جب کہ شام کے پاس اس قسم کی کوئی قدرتی دولت نہیں۔ دوسری طرف حدیث کی پیشین گوئیوں کے مطابق، حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول شام کے شہر دمشق میں ہوگا جو کہ بلاشبہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد سے قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تقسیم کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس نے امریکہ کو بہترین جغرافیہ دیا اور بنگلہ دیش کو اس کے برعکس جغرافیہ۔ کسی کو معتدل موسم سے نوازا اور کسی کے حصہ میں سخت موسم لکھ دیا۔ بعض ملکوں کے نیچے دولت کے خزانے رکھ دئے مگر نزول مسیح جیسے غیر معمولی واقعہ کے ظہور کے لئے ایک ایسے علاقہ کو منتخب کیا جو مادی دولت میں دوسرے خوش نصیب ملکوں سے پیچھے تھا۔ موجودہ دنیا میں ہمارے لئے صرف یہی ممکن ہے کہ ہم اس "تقسیم" پر راضی ہو جائیں۔ اس ربانی تقسیم میں کیا کیا مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو جاننے کے لئے قیامت کا انتظار کرنا چاہئے۔

خلیج کے موجودہ بحران کے نتیجہ میں بالکل نئے قسم کے حالات سامنے آئے ہیں۔ مثلاً شام اسرائیل کا سخت دشمن تھا، کیوں کہ ۱۹۶۵ کی جنگ میں اسرائیل نے شام کا ایک علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ چوں کہ امریکہ اسرائیل کا ساتھی ہے، اس لئے شام کو امریکہ سے بھی سخت دشمنی تھی۔ مگر کویت کی صورتحال

پیش آنے کے بعد اس نے امریکہ سے تعلق قائم کر لیا اور اپنی فوجیں سعودی عرب بھیج دیں جہاں وہ امریکہ کے ماتحت عمل کریں گی۔ مسٹر جی ایچ جانسین (G.H. Jansen) نے اس واپسی کو یوٹرن (U-turn) کا نام دیا ہے۔

دمشق کے ہوائی اڈہ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ خلیج کے بحران پر گفت گو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کویت تو اس سے پہلے عراق کا ایک حصہ تھا۔ اور بصرہ کے ماتحت تھا۔ ایسی حالت میں اگر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر لیا ہے تو اس کے لئے یورپ اور امریکہ کی فوج بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو صاحب حق کو اس کا حق ملنے کے ہم معنی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں کہ کویت اس سے پہلے عراق کا حصہ تھا۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کویت عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا جس طرح خود عراق عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ البتہ کویت چوں کہ بہت چھوٹا ملک تھا اور اس وقت اس کی آبادی بہت کم تھی، اس لئے عثمانیوں نے اس کو بصرہ کے گورنر کے ماتحت کر رکھا تھا۔

تاہم اس سے قطع نظر، بجائے خود یہ ایک غلط اصول ہے کہ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ ماضی کی بنیاد پر کیا جائے۔ اگر یہ کوئی صحیح اصول ہو تو پھر فلسطین پر یہودیوں کے قبضہ کو بھی جائز قرار دینا چاہئے، کیوں کہ ایک زمانہ میں فلسطین بھی یہودی سلطنت کا حصہ تھا۔ مزید یہ کہ یہودیوں کو فلسطین کا علاقہ خود خدا کی طرف سے بطور انعام دیا گیا تھا۔ بین اقوامی دنیا میں اگر اس اصول کو چلایا جائے تو ساری دنیا کا جغرافیہ از سر نو بنانا پڑے گا۔ کیا صدام حسین کے حامی اپنے نظریہ کے اس وسیع انطباق کے لئے تیار ہیں۔

عام حالات میں یہ جہاز دمشق سے سیدھا کراچی جاتا ہے۔ مگر آج وہ کویت سے آئے ہوئے لوگوں کو لینے کے لئے عمان ایئرپورٹ پر اترا۔ یہاں ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرا رہا۔ تمام سیٹیں بھر گئیں۔ آنے والے لوگ جب جہاز کے اندر داخل ہوئے تو میں ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ ان کے چہرہ پر خوشی کے آثار تھے۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ اب وہ بحرانی دور سے باہر آچکے ہیں اور چند گھنٹے کے بعد وہ اپنے وطن میں پہنچ جائیں گے۔

آدمی پر مشکلیں پیش آتی ہیں۔ جب وہ مشکلوں کے اندر گھرا ہوا ہو تو وہ سخت مایوسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر جب حالات بدلتے ہیں تو اچانک وہ اطمینان کی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ وہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ اگر یہ بھولنے کا مادہ آدمی کے اندر نہ ہو تو اس کے لئے زندگی گزارنا سخت مشکل ہو جائے۔

۱۴ اکتوبر کو صبح ساڑھے چار بجے کراچی پہنچا۔ یہاں ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر دو دن قیام رہا۔ میرا قیام جناب طارق رحمٰن صاحب (گلشن اقبال) کے یہاں تھا۔

پاکستان کے سفر کا پروگرام ابتداءً ۱۹ فروری کے لئے طے ہوا تھا۔ اس کے مطابق انڈین ایئر لائنز سے ریزرویشن بھی کرایا جا چکا تھا۔ مگر ۱۴ فروری کو کراچی سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ کراچی میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ فساد اور کرفیو کی وجہ سے اجتماع کا پروگرام چلانا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ ۱۹ فروری کو سفر کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

اس قسم کا التواء اس سے پہلے کشمیر کے سلسلہ میں بھی پیش آیا تھا۔ کشمیر (سرینگر) کا ایک پروگرام ۲۰ اگست ۱۹۸۹ کے لئے طے ہوا تھا۔ اس کا اعلان ہو چکا تھا اور اس کا رزرویشن بھی کرایا جا چکا تھا۔ مگر آخر وقت میں ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ کشمیر میں حالات بگڑ گئے ہیں اور اجتماع کا انتظام ممکن نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان توڑ پھوڑ کی جو سیاست جگہ جگہ چلا رہے ہیں۔ اس سے انھوں نے پایا تو کچھ نہیں، البتہ یہ نقصان ہوا کہ ناقابل تلافی حد تک دعوتی اور تعمیری کام کے مواقع ختم ہو گئے۔

پاکستان کے مذکورہ پروگرام کی وجہ سے مجھے دوسرے کئی پروگرام چھوڑنے پڑے تھے۔ ۲۲ فروری ۱۹۹۰ کو لکھنؤ میں سیرت کا جلسہ تھا۔ اس کا ٹکٹ آچکا تھا۔ مگر مجھے معذرت کرنی پڑی کہ میں ۲۲ فروری کو وہاں کا سفر نہ کر سکوں گا۔ وغیرہ

کراچی کا مذکورہ پروگرام فاران کلب نے بنایا تھا۔ ۱۹ فروری سے ۲۶ فروری تک کا پورا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ مگر آغاز سفر سے چند دن پہلے کراچی کے ٹیلیفون پر سفر کو منسوخ کرنا پڑا۔

اس طرح پاکستان کے سفر کا باقاعدہ پروگرام بار بار ملتوی ہوتا رہا۔ آخر میں میں نے طے کیا کہ موجودہ سفر کے تحت ٹرانزٹ کے طور پر ایک دو دن کے لئے کراچی میں قیام کروں۔ چنانچہ دہلی میں پاکستانی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کر لیا گیا تاکہ واپسی کے موقع پر کراچی میں قیام کیا جا سکے۔

باہر کے سفروں میں پہلا مرحلہ ویزا کا ہوتا ہے۔ نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ سے ویزا بن کر آیا تو اس پر لکھا ہوا تھا پولیس رپورٹنگ سے مستثنیٰ (Exempted from police reporting) ویزا کی فیس بھی انھوں نے ازراہ عنایت لوٹا دی تھی اور "فری" ویزا جاری کر دیا تھا۔

یہ واقعہ دیکھ کر دل نے کہا کہ کاش یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے دن بھی کیا جائے۔

آخرت میں مجھے کہہ دیا جائے کہ عمل کی قیمت دینے سے تم کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ نیز تم کو اس سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا ہے کہ تم کو فرشتوں کی جانچ کے مرحلہ سے گزرنا پڑے۔ اور اللہ کے لئے یقیناً ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔

۴ اکتوبر کو ظہر کی نماز گلشن اقبال (بلاک نمبر ۷) کی جامع مسجد میں پڑھی۔ پوری مسجد ایک بڑے ہال کی صورت میں ہے۔ اس کے اندر اور باہر بالکل فطرت کا ماحول ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں ایک روحانی مرکز میں ایک روحانی عمل ادا کر رہا ہوں۔

جب میں مسجد کے اندر بیٹھا ہوا تھا، مجھے خیال آیا کہ اگر مسلمان ان تمام جھگڑوں کو ختم کر دیں جن کو وہ اسلام کے نام پر غیر ضروری طور پر جاری کئے ہوئے ہیں، اور اسلام کی نمائندگی کے لئے صرف اس قسم کی مسجدیں دنیا میں باقی رہیں تو دنیا کی آدھی آبادی صرف ان مسجدوں کو دیکھ کر اسلام قبول کر لے۔ دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں کے مقابلہ میں مسجد کا ماحول نہایت فطری اور سادہ ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی بے فائدہ سیاسی اور مادی اور قومی ہنگامہ آرائیوں نے اسلام کے اس فطری حسن پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر مسلمان صرف اتنی قربانی کریں کہ وہ کچھ نہ کریں تو اسلام اپنے آپ دنیا کو اپنی طرف کھینچے گا اور لوگ جوق در جوق دین فطرت کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے۔

ایک پاکستانی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس سال ہائی اسکول پاس کیا ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں ہندو لڑکے تعلیم کے میدان میں مسلمان لڑکوں سے آگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، یہ بات صحیح ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے ایک استاد نے ایک مرتبہ یہی بات ہم لوگوں سے کہی۔ انھوں نے اس کا راز یہ بتایا کہ ہندو لڑکوں میں مل کر پڑھنے (combined study) کا رواج ہے۔ مل کر پڑھنے سے ہر ایک کو دوسرے کی معلومات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، ایک طالب علم ذاتی طور پر پڑھے تو اس کو ایک درجہ فائدہ ملے گا۔ مگر جب کئی طالب مل کر مطالعہ کریں تو ہر ایک کو کئی گنا زیادہ فائدہ ملنے لگتا ہے۔

کراچی کے روزنامہ جنگ (۳ اکتوبر) میں "جنگ الکشن سیل" کی طرف سے ایک تجزیہ چھپا تھا۔ اس میں ۱۹۸۸ میں ہونے والے الکشن کی ان ۳۴ نشستوں کا ذکر تھا جو اسلامی جمہوری اتحاد اور دوسری جماعتوں اور آزاد امیدواروں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو مل گئیں۔ ان جماعتوں میں ووٹ بٹ جانے کے باعث پیپلز پارٹی جیت گئی۔

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ یہ پوری سچائی نہیں۔ مضمون نگار نے نام بنام تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ یہی واقعہ خود پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اس کے اپنے دائرہ میں بھی کئی جگہ امیدواروں کی کثرت کی بنا پر اس کے ووٹ بٹ گئے اور وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلہ میں ہار گئی۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ اس نے باقاعدہ تفصیلات جمع کیں تو حیرت انگیز طور پر ان نشستوں کی تعداد بھی ۳۴ ہی تھی جو پیپلز پارٹی نے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر کھو دیں۔ یعنی اپنے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر اسلامی جمہوری اتحاد نے بھی ۳۴ نشستیں کھوئیں۔ اور اسی طرح پیپلز پارٹی نے بھی ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر ۳۴ نشستیں کھو دیں۔

اختلافی معاملات میں لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے موافق آدھی بات کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے مخالف آدھی بات کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ طریقہ نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کریں وہ ہمیشہ حقیقت کی دریافت میں ناکام رہتے ہیں۔

۵ اکتوبر کی صبح کو گلشن اقبال میں ایک نشست ہوئی۔ اس میں کراچی کے کچھ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ ابتداءً میں نے دعوت اسلامی کے جدید امکانات پر گفتگو کی۔ نیز بتایا کہ ان دعوتی امکانات کو استعمال کرنے کے لئے "صبر" کی صفت درکار ہے۔ یعنی ناخوشگوار باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنی ساری توجہ دعوت کے عمل پر لگانا۔ گفتگو کے آخر میں سوال و جواب ہوا۔ یہ نشست تقریباً ۳ گھنٹہ جاری رہی۔

مہاجر تحریک کے قائد الطاف حسین صاحب یہاں کی مشہور شخصیت ہیں۔ ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے سنا تھا کہ ان کے جلسہ میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ اس لئے میں ان کو سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ وی سی آر پر ان کا ایک پروگرام دیکھا۔ وہ نومبر ۱۹۸۹ میں لاہور گئے تھے۔ یہ ویڈیو کیسٹ اسی سفر سے تعلق رکھتا تھا۔

الطاف حسین صاحب نہایت پرجوش انداز میں بولتے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو زبان کے ساتھ ان کا پورا جسم بھی مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ "مہاجر پاکستان میں مہاجر بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ پاکستانی بن کر رہنے آیا تھا۔ مگر جب ہم نوکری کے لئے گئے تو ہم سے پوچھا گیا کہ تمہارا باپ کہاں پیدا ہوا تھا، تمہارا دادا کہاں پیدا ہوا تھا، اس امتیاز نے ہم کو مہاجر بنا دیا۔" "ہم اپنے وطن میں بے وطنی کا طعنہ سنتے ہیں۔ ہم اپنا حق مانگتے ہیں تو ہم کو کلاشنکوفوں سے بھون دیا جاتا ہے۔" "ہمارے خلاف بالقصد فسادات

کرائے جاتے ہیں تاکہ مہاجر اور غیر مہاجر کے درمیان جھگڑا ہو۔ یہ فسادات ایک منظم سازش کے تحت ہو رہے ہیں۔" مہاجرین کی بستی علی گڑھ پر حملہ کیا گیا اور چھ گھنٹہ تک ہم گولیوں سے بھونے جاتے رہے۔ مگر کوئی ہمارے لئے بولنے والا نہیں۔ اس چیز نے مہاجر تحریک پیدا کی۔"

الطاف حسین صاحب کی تقریر کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس نے انھیں لیڈر بنایا ہے۔ یہ دراصل مہاجرین کا احساس مظلومی ہے۔ وہ مظلوم مہاجرین کے احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس نے ان کو مہاجرین کا لیڈر بنا دیا ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال ہندستان میں بھی ہے۔ جو شخص مسلمانوں کے احساس مظلومی کی ترجمانی کرتا ہے وہ ان کے درمیان فوراً مقبول ہو جاتا ہے۔ مگر سچا لیڈر وہ ہے جو لوگوں کے احساس یافت کو جگا کر ان کا قائد بنے۔

سفر کے دوران میں نے ایک پائلٹ سے پوچھا کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہوائی جہاز کو ہم نہیں اڑاتے۔ یہ دراصل نیچر کا قانون ہے جو ہوائی جہاز کو اڑاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہوائی جہاز کی مخصوص وضع، اس کا پنکھا، انجن کے ذریعہ تیزی سے پیچھے کی طرف ہوا نکالنا، اور رن وے پر اس کو تیزی سے دوڑانا، اس قسم کی کچھ چیزیں جب آپ ایک مشین میں جمع کریں تو وہ اپنے آپ اوپر اٹھنے لگتی ہے۔ یہ نیچر کا قانون ہے، اور اسی قانون کو استعمال کر کے ہم ہوائی جہاز کو اڑاتے ہیں۔

امکانات فطرت کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ٹکنولوجی ہے۔ پانی کو سو ڈگری تک حرارت پہنچائیں تو اس کے مالے کیول ٹوٹنے لگتے ہیں جس کا دوسرا نام ابلنا ہے۔ مقناطیسی فیلڈ اور موشن کو یکجا کریں تو الیکٹران دوڑنے لگتے ہیں جس سے بجلی تیار ہوتی ہے۔ اسی طرح مقناطیسی فیلڈ اور کرنٹ کو یکجا کریں تو موشن پیدا ہو جاتا ہے جس سے تمام مشینیں چلتی ہیں۔ اسی طرح کچھ خاص چیزوں کو یکجا کریں تو مشین اوپر اٹھنے لگتی ہے جس سے ہوابازی کی صنعت وجود میں آئی ہے۔

اس دنیا میں امکاناتِ فطرت کو استعمال کرنے ہی کا نام کامیابی ہے۔ اسی سے تمام ٹکنولوجی ظہور میں آئی ہے۔ اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کوئی حقیقی کامیابی اس وقت ملتی ہے جب کہ زندگی کے امکانات کو سمجھا جائے اور اس کو حکمت کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کا ماحول تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ طلبہ

تعلیم سے زیادہ سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پاکستان میں یہ برائی سب سے پہلے جماعت اسلامی نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے زمانہ میں شروع کی۔ انھوں نے طلبہ کو منظم کرکے انھیں اپنی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ جب دوسری جماعتوں نے دیکھا کہ جماعت اسلامی طلبہ کو سیاسی طاقت کے طور پر استعمال کر رہی ہے تو وہ بھی یہی کرنے لگے۔ کسی قوم کے نوجوانوں کو تعلیم سے ہٹا کر سیاست میں لگانا بلاشبہ اس قوم کے ساتھ دشمنی ہے، اور دشمنی کی یہ قسم ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

ایک صاحب جو یہاں کی اصطلاح میں "مہاجر" ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم نے زبردست تحریک چلا کر پاکستان بنوایا۔ ہم سمجھتے تھے کہ پاکستان بنتے ہی برصغیر کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر پاکستان کو بنے ہوئے آدھی صدی بیت گئی اور مسائل کا حل ہونا تو درکنار، ان میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔

میں نے کہا کہ یہ سادہ سی بات نہیں بلکہ بہت گمبھیر بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ برصغیر ہند کے ہندو مسلمانوں کے لئے مدعو کے درجہ میں تھے۔ مسلمانوں کو انھیں دین حق کا پیغام دینا تھا۔ مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے ہندوؤں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھ کر ان سے ٹکراؤ شروع کر دیا۔ انھوں نے علیحدگی اور تقسیم کا نعرہ لگایا۔ آخر کار مقاطعہ اور مہاجرت کی وہ صورت سامنے آئی جس کا نام پاکستان ہے۔

اس طرح کا عمل اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ کی مرضی یہ ہے کہ مدعو قوموں کو دعوت دی جائے اور یک طرفہ صبر کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کے مرحلہ تک پہنچایا جائے۔ اتمام حجت سے پہلے اگر مقاطعہ اور مہاجرت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ اللہ کے نزدیک سراسر غلط ہوگا۔

پاکستانی مسلمانوں کو میرا مشورہ ہے کہ ہندستان کے معاملہ میں وہ اپنے عداوتی ذہن کو بدلیں۔ ہندستان کی طرف سے اگر کوئی زیادتی کی بات ہوتی ہے تو اس کو نظر انداز کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر اس کے خیر خواہ بنیں۔ پاکستان کے مسلمان اگر ایسا کر سکیں تو یہاں سے وہ اپنی ایک نئی تاریخ کا آغاز کر سکتے ہیں۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۰ کی صبح کو میں دوبارہ دہلی واپس پہنچا۔

۱ غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مذہب فرقہ پرستی نہیں سکھاتا۔ اس سمپوزیم کی دعوت میں مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی گئی۔ اس خلاصہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں یا اور دوسرے تمام جھگڑوں کو ختم کرنے کی تدبیر اعراض ہے۔ گھر سے لے کر باہر تک کے تمام جھگڑوں کا واحد حل یہی ہے۔

۲ دوردرشن (نئی دہلی) نے نیشنل پروگرام کے تحت ۱۳ دسمبر کی شام کو اور ۱۷ دسمبر ۱۹۹۲ کی صبح کو صدر اسلامی مرکز کے دو خطابات نشر کئے۔ ان دونوں خطابوں میں خصوصیت سے امن اور انسانیت پر زور دیا گیا تھا۔

۳ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ اس انٹرویو میں بتایا گیا تھا کہ اسلام ہر حال میں امن کا پیغام دیتا ہے۔ سماج میں امن کا ماحول قائم کرنا اسلام کا اہم ترین تقاضا ہے۔

۴ اچاریہ منی سوشیل کمار، سوامی چیدانند، شانتی لال موتھا اور صدر اسلامی مرکز کے تعاون سے ایک شانتی یاترا نکالی گئی۔ یہ شانتی یاترا ۱۵ دسمبر کو پونہ سے شروع ہوکر ۲۱ دسمبر ۱۹۹۲ کو ناگپور میں ختم ہوئی۔ اس کا مقصد امن اور انسانیت کا پرچار کرنا تھا۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت ملاحظہ کریں۔

۵ انگریزی ہفتہ وار ایشیا ویک کے نمائندہ مسٹر روی نے ۲۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ ایشیا ویک ہانگ کانگ سے نکلتا ہے۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ۶ دسمبر کے بعد پیش آنے والے حالات سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈیا میں ہمارے لئے جو آپشن ہے وہ سیکولرزم اور ہندو ازم کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ اصلی آپشن سیکولرزم اور انارکی کے درمیان ہے۔ اگر سیکولرزم کو چھوڑ دیا گیا تو اس کے بعد ملک میں جو چیز آئے گی وہ انارکی ہوگی نہ کہ فی الواقع ہندو ازم یا ہندو راشٹریہ۔

۶ پی ٹی آئی کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۲ جنوری ۱۹۹۳ء کو بیشتر انگریزی اور ہندی روزناموں میں شائع ہوا۔ اس کا ایک حصہ دوردرشن نے بھی بتایا۔

اس انٹرویو کا موضوع زیادہ تر موجودہ حالات اور مسلمان تھا۔

۷ ہندی روزنامہ جن ستّا کے نمائندہ مسٹر رام بہادر رائے نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو جن ستا کے شمارہ ۳ جنوری ۱۹۹۳ میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ زیادہ تر سوالات وجواب کا تعلق موجودہ حالات سے تھا۔

۸ ۴ جنوری ۱۹۹۳ کو آل انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک مذاکرہ ہوا۔ اس کا عنوان تھا :

Tackling the Ayodhya crisis

اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کا موضوع اجودھیا مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس مذاکرہ میں شرکت کی اور وہاں بتایا کہ اسلام کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ اس کی تفصیلی رپورٹ اخبارات میں آچکی ہے۔ مثلاً قومی آواز (۵ جنوری ۱۹۹۳) میں۔

۹ سندھیا جین نمائندہ سنڈے میل، نے ۱۳ جنوری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق نئے ہندستان میں مسلمانوں کی پوزیشن سے تھا۔

۱۰ ودیشا (مدھیہ پردیش) کے ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ودیشا کا سفر کیا۔ ۱۲ جنوری ۱۹۹۳ کو وہاں دو پروگرام ہوئے۔ ایک عمومی اجتماع۔ اس میں ۹۵ فیصد تعداد ہندو تعلیم یافتہ حضرات کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک پریس کانفرنس ہوئی۔ خطاب کا موضوع تھا : بہتر سماج کی تعمیر۔

۱۱ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں : میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ الرسالہ بھی پڑھتا ہوں۔ ان کو پڑھنے کے بعد میں نے صحیح طور پر اسلام کو سمجھا۔ اور فکری طور پر اس کی طرف مائل ہوا۔ اس سے پہلے میں نماز نہیں پڑھتا تھا۔ مگر اللہ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ ہدایت دینا منظور تھا۔ اب میں پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا ہوں (سید محمد برکت الرحمٰن، کھرگ پور، بنگال)

الرسالہ بک سنٹر

اردو، ہندی، انگریزی اور عربی میں ملک اور بیرونِ ملک
کی چھپی ہوئی دینی، علمی اور ادبی کتابوں کا عظیم مرکز

- قرآن • حدیث • تفسیر • سیرت وسوانح • فقہ وقانون
- عقائد • دعوت وتبلیغ • تاریخ • اسلامی تحریک • اخلاقیات
- خواتین اور بچوں کے لیے دینی اور اصلاحی کتابیں • ڈکشنریاں اور علمی مراجع
- پاکستان کی چھپی ہوئی علمی، ادبی اور دینی کتابیں • سیاست
- قاہرہ اور بیروت کی چھپی ہوئی عربی کتابیں • اسلامی معاشیات
- اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر معیاری کتابیں • ثقافت اور تعلیم
- اسلامی مجلات ورسائل • دیگر ادیان ومذاہب کی بنیادی کتابیں
- زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ انسانیت سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ کتابیں
- اسلامی موضوعات پر آڈیو اور ویڈیو کیسٹ • طغرے اور عید کارڈ وغیرہ

نمبر ۱ نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون: ۶۱۱۱۲۸، ۶۹۷۳۳۳

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	6/-
عظمت صحابہ	6/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	60/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	45/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	35/-
ڈائری جلد اول	95/-
ڈائری جلد دوم	
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	95/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیات اسلام	–
تعدد ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقت اسلام	=
علماء اور دور جدید	–
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرت رسولؐ	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-

ہندی

سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-

عربی

الاسلام یتحدی	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	55/-

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقت ایمان	25/-
A-2	حقیقت نماز	25/-
A-3	حقیقت روزہ	25/-
A-4	حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقت حج	25/-
A-6	سنت رسولؐ	25/-
A-7	میدان عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحاد ملت	25/-
A-12	تعمیر ملت	25/-
A-13	نصیحت لقمان	25/-

تذکیر القرآن کیسٹ
(تلاوت، ترجمہ و تفسیر)

A-14	متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15	متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16	متفرق سورتیں ۳	30/-

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب	200/-
V-2	اسلام داعی امن	200/-
V-3	اسلام دور جدید کا خالق	200/-
V-4	امت مسلمہ اور جدید چیلنج	200/-
V-5	اسلام اور سماجی انصاف	200
V-6	اسلام اور دور حاضر	200/-

God Arises	75/-
Muhammad The Prophet of Revolution	75/-
Islam As It Is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	=
Introducing Islam	–
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	–
Islam the Creator of Modern Age	–
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	–
Words of Wisdom	–

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1982	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984 تا 1991	80/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91	85/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ

THE ISLAMIC CENTRE C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013